MARCH
2024

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب توقیر احمد شریفی، جناب نوید صادق، جناب خالد علیم، جناب طارق بٹ

جناب خالد علیم، جناب باقر علی شاہ، جناب نوید صادق

جناب خالد علیم، جناب باقر علی شاہ، جناب مظہر سلیم مجوکہ

بانی مدیر: خالد احمد

ابتدائیہ

اے واسعِ شرق و غرب و جنوب و شمال
ہر سمت پرچم کشا اک ترا نام ہے

اک حرف میرے لیے اے خدائے کمال
اے واسعِ شرق و غرب و جنوب و شمال
اک رنگ میرے لیے اے خدائے جمال
جھولی پسارے مرا خامۂ خام ہے

اے واسعِ شرق و غرب و جنوب و شمال
ہر سمت پرچم کشا اک ترا نام ہے

اے بارگاہِ جمال و جمال آفریں
جھولی پسارے مرا خامۂ خام ہے

اے بارگاہِ کمال و کمال آفریں
اے بارگاہِ جمال و جمال آفریں
اے بارگاہِ خیال و خیال آفریں
ہر سمت پرچم کشا اک ترا نام ہے

اے بارگاہِ جمال و جمال آفریں
جھولی پسارے مرا خامۂ خام ہے

خالد احمد

نوحہ کناں ہواؤ شعلہ بہ جاں فضاؤ
دیکھو وہ جا رہا ہے جی بھر کے اس کو رو لو

ادارہ بیاض انتہائی دکھ سے قارئین کو مطلع کرتا ہے کہ دی ٹیک آرگنائیزیشن کے بانی اور چیئرمین میاں طارق محمود مختصر علالت کے بعد 03 جنوری 2024 کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ میاں طارق محمود وطن عزیز کے حقیقی سپوت تھے جنھوں نے اپنے کاروباری ادارے کو ملکی قوانین کے عین مطابق اعلیٰ ترین اصولوں اور اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا جبکہ ادارے کے ملازمین کی پیشہ ورانہ تربیت و ترقی ان کی اولین ترجیح و مقصد تھا۔ ظرف و انسانیت ایسی کہ ادارے سے منسلک ہر فرد کو اپنے بچوں جیسی عزت اور مدد دی۔ ان کا ادارہ گزشتہ پچپن برس سے ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے اور ادارے کے تربیت یافتہ افراد دنیا بھر میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اوصاف یقیناً ان کے خاندان اور والد میاں عبدالخالق کی میراث ہیں۔ میاں عبدالخالق کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ قائداعظم کے سرگرم کارکن اور آزادی کے سپاہی تھے جو پاکستان کی تخلیق کے بعد تعمیر کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ مینارِ پاکستان اور قذافی سٹیڈیم لاہور ان کی تعمیری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میاں طارق محمود بلند پایہ کردار اور اپنے آپ میں ایک الگ ہی جہاں بسائے ہر فن مولا شخصیت کے مالک تھے، ایک حقیقی دانشور اور تخلیقی ذہن جو گر لکھاری ہوتا تو لاجواب ہوتا۔ ایسا علم و ادب و کتاب پرست کہ کسی بھی ادیب، شاعر، لکھاری، حالاتِ حاضرہ، معیشت، معاشرت یا موضوع پر اعلیٰ پائے کی مدلل گفتگو کر سکے۔ اسی باعث خالد احمد اور ادارہ بیاض سے باہمی عزت اور تکریم کا ایک تعلق بنا جو ایک دہائی سے قائم و دائم ہے۔

ادارہ بیاض بیگم طارق محمود، محمد علی طارق، اسد طارق، مریم طارق اور تمام لواحقین بشمول دی ٹیک آرگنائزیشن کے ملازمین سے دلی تعزیت کرتا ہے اور غم کی اس گھڑی میں برابر کا شریک ہے۔

اللہ تعالیٰ میاں طارق محمود صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - مارچ 2024 - شمارہ نمبر: 3

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب خالد علیم

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور پبلشر و پرنٹر نے زیک لمیٹڈ پلاٹ نمبر 16 کلومیٹر روڈ بالمقابل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمدیہ	خالد احمد	7
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، خورشید ربانی، رضا اللہ حیدر، فیض رسول فیضان، نبیل احمد نبیل، خالق آرزو	8 تا 16
3	عقیدت	خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، مرزا آصف رسول	17 تا 19
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	20 تا 22
5	گوشہ خالد علیم	مضامین رشید امجد، حامد یزدانی، نوید صادق، جعفر بلوچ	23 تا 37
		خالد علیم ..... اہلِ ادب کی مختصر آرا احمد ندیم قاسمی، خالد احمد، خورشید رضوی، خواجہ محمد زکریا، سلیم کوثر، باقی احمد پوری، سیف اللہ خالد، ضیا الحسن، خالد قیوم تنولی، اشرف سلیم، رحمان حفیظ، محمد عاصم بٹ	38 تا 43
		خالد علیم ..... "کلیاتِ نما" آفتاب خان	44 تا 49
		غزلیں	50 تا 52
6	افسانے	بلقیس ریاض، دردانہ نوشین خان، پیرو زبخت قاضی، ظہیر پراچہ	53 تا 70

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، گلزار بخاری، راحت سرحدی، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، اقبال سروبہ، سید قاسم جلال، اجمل اعجاز، احمد جلیل، نثار ترابی، خالدہ انور، سعد اللہ شاہ، عقیل رحمانی، مسعود احمد، افروز رضوی، مظہر امام، شوکت محمود شوکت، ہمایوں پرویز شاہد، طاہر ناصر علی، اکرم ناصر، انصر حسن، افتخار شوکت، سرور فرحان، راجہ عبد القیوم، ریاض ندیم نیازی، اویس الحسن، عابد معروف مغل، فرخندہ شمیم، صغیر احمد صغیر، آفتاب خان، احمد سجاد آکاش، علی حسین عابدی، ارشد محمود ارشد، ظہور چوہان، عزیز عادل، محمد اشرف کمال، میثم محسن، محمد اشفاق بیگ، اصغر علی بلوچ، مستحسن جامی، فخر عباس، ساگر حضور پوری، عاصم اعجاز، اکرم جاذب، اکمل حنیف، شاہد فرید، یاسر رضا آصف، زبیر خیالی، نبیل احمد نبیل، اسد رضا سحر، محمود کیفی، ساجد رضا خان، نائیلہ راٹھور، فصیحہ آصف خان، بشیر احمد حبیب، رخسانہ سحر، سرفراز عارض، عطا العزیز، رمیض نقوی، عاصم بخاری، انصر رشید انصر، محمد نور آسی، شہباز حیدر، حیا قریشی، سید تیمور کاظمی، حسنین مظہری، ناشط مقبول، خفی الرحمٰن انجم، عنبرین خان، شمسیلہ سعید، سمیع احمد ثمر	71 تا 143
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	144 تا 152
9	طنز و مزاح / خاکے	ہمایون خان	153 تا 155
10	مضامین	جلیل عالی، حنیف باوا، نسیم سحر، اسلام عظمی، حامد یزدانی، ظفر معین بلے، قمر رضا شہزاد، نبیل احمد نبیل، فیصل زمان چشتی، محسن خالد محسن، نیر سرحدی، سیدہ سلطانہ، یاسر رضا آصف، صدام ساگر، طلحہ غفور	156 تا 217
11	نظمیں	جلیل عالی، گلزار بخاری، خاور اعجاز، اسلام عظمی، سلطان صدیق رضی، محمد انیس انصاری، طالب انصاری، رخشندہ نوید، فرخندہ شمیم، شوکت محمود شوکت، طاہر ناصر علی، شاہین عباس، ریاض ندیم نیازی، نیلم احمد بشیر، نائیلہ راٹھور، علی حسین عابدی، امجد بابر، عاصم بخاری، فصیحہ آصف خان، صبا نیاز صدیقی، فاطمہ عثمان، مہر علی	218 تا 240
12	خطوط	حامد یزدانی	241

حمدیہ

ربِّ گل! ربِّ رنگ! ربِّ بہار!
ایک نقش اور، ربِّ نقش و نگار!

وسعتِ کائناتِ عشق دِکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

کس لیے ارد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ دَر و دیوار

جرسِ گل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار

راکھ کب تک کریدتے دل کی
ڈال کر سر پہ ہو گئے تیار

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار

اِک نم آہنگ حزنیہ لَے پر
کیسے تھم تھم کے چل رہے تھے یار

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دِلاوروں کا شمار

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

اک مذلّت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار

تختِ مرمر پہ کل تھے آسودہ
مرمر آسودگان زیرِ مزار

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

خالد احمد

نعتؐ

ہر کنجِ جاں سے خوف کے سائے پرے رہے
اک بابِ وا کے ہم کو سدا آسرے رہے

اک یاد جس سے سانس کی کلیاں کھلی رہیں
اک یاد جس سے آس کے ساغر بھرے رہے

سارا اُسی حصارِ نظر میں کٹا سفر
طوفاں میں اپنے بخت شکارے تَرے رہے

ہر گھات اُسؐ نے اپنی حفاظت میں لے لیا
سب خواب دشمنوں کے دھرے کے دھرے رہے

جب بھی اٹھے اُسیؐ کی رضا رُخ اٹھے قدم
روکا جدھر سے اُسؐ نے اُدھر سے ڈرے رہے

کوئی بھی ہو زمین و زماں ، ہر زبان پر
بس اُسؐ مہِ تمام ہی کے تذکرے رہے

اتری ہیں جن پہ اُسؐ کی محبت کی شبنمیں
عہدِ خزاں میں بھی وہ گلستاں ہرے رہے

اُس میرِ دو جہاںؐ کا ہے فیضاں کہ اپنے دل
کھوٹی رُتوں کے بیچ بھی عالی کھرے رہے

جلیل عالی

نعتؐ

مِرا مرکز ، مِرا مامن مدینہ
کہے ہے دل کی ہر دھڑکن مدینہ

مَیں صحرا ہوں ، مگر تشنہ نہیں ہوں
ہے میری پیاس پر ساون مدینہ !

مُجھے درپیش کیوں ہو کوئی اُلجھن
مِٹا دیتا ہے ہر اُلجھن مدینہ

مدینے سے سفر کرنے لگوں مَیں
تو بڑھ کر تھام لے دامن مدینہ

کرن چمکی تھی اِک غارِ حرا سے
زمانے بھر میں ہے روشن مدینہ

یہ دُنیا اِک اندھیری رات جیسی
اور اِس میں نُور کا روزن مدینہ

بھرم قائم ہے میرا تو اِسی سے
مری عِزّت کا پیراہن مدینہ

نسیم سحر

نعتؐ

کون کہتا ہے ہنر ہے مدحت
حاصلِ دیدۂ تر ہے مدحت

خلوتوں میں جو پڑھے ہیں اکثر
اُن درودوں کا ثمر ہے مدحت

منزلِ شوق نبیؐ کا در ہے
شوق کی راہگذر ہے مدحت

ہر قدم حدِّ ادب ہے اے دل!
ایک محتاط سفر ہے مدحت

سعیِ مشکور ثنا ہے اُنؐ کی
غایتِ فکر و نظر ہے مدحت

اب مجھے لفظ ضیا دیتے ہیں
نیّرِ علم و خبر ہے مدحت

وجد میں حرف و نگارش ہر دم
دھیان میں شام و سحر ہے مدحت

جو خزاؤں میں بھی سرسبز رہے
ایسا پُرکیف شجر ہے مدحت

جانے کیا کیا نظر آئے ہے مجھے
اے قمر نورِ بصر ہے مدحت

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

دل میں ٹھانی تھی کہوں نعت، بنوں نعت سرا
ہائے یہ عجزِ بیاں، یوں نہیں ہونے دیتا

اَن گنت آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کا بیاں
کاش! ہو دستِ قلم ایسا، وہ سب کچھ لکھتا

یہ جہاں آپؐ کے صدقے میں ملا ہے ہم کو
کیسا گل رنگ، ضیا بار ہے اس کا نقشہ

سدرہ سے آگے گئے، آپؐ خدا تک پہنچے
آپؐ کی رفعت وعظمت کا ہے گھر گھر چرچا

آپؐ کے حُسنِ عمل سے ہوئی دنیا روشن
آخرِ کار سنوارے گا عمل ہی عقبیٰ

آپؐ کی سیرتِ اطہر سے اُجالے پھوٹے
زندگی! تیرا اندھیروں سے ہے پیچھا چھوٹا

آپؐ کے دم سے ہوئی عقل خجستہ اطوار
عشق بے خوف وخطر آگ میں ہے جا کودا

آپؐ کی سعی مبارک ہے نہایت نافع
رشد کی عالمی تحریک ہے جس سے برپا

الکتاب آپؐ کی سیرت کا قصیدہ ٹھہرا
معجزہ سب سے بڑا آپؐ پہ قرآں اُترا

آسماں! ناز ترا، چاند ستارے تیرے
اے زمین! نازشِ روضہ ہے فروزاں تیرا

وجہِ تغییر ہوئی آپؐ کی تقلید ریاض
مجھ سے ناخوب کو بھی خوب طرح سے بدلا

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

گو ستاروں کا تاجدار ہے چاند
رہِ شہؐ کا مگر غبار ہے چاند

اک اشارے پہ ہو گیا قربان
جاں نثاری کی یادگار ہے چاند

اُنؐ کے دیدار سے مشرف ہے
گویا اصحابؓ میں شمار ہے چاند

قدرتِ مصطفیٰؐ کا معجزہ ہے
ہو کے دو نیم برقرار ہے چاند

ہے اطاعت گزار سورج بھی
شب میں لیکن ضیا شعار ہے چاند

سبز گنبد کو چومتی ہے ہوا
اور حسرت سے بے قرار ہے چاند

طلعتِ نورِ مصطفیٰؐ کے طفیل
نور افشاں و نور بار ہے چاند

خورشید ربانی

نعتؐ

ہیں گلشنِ مدینہ میں راحت کے سلسلے
پھیلے ہوئے ہیں چار سو رحمت کے سلسلے

دنیا و آخرت میں وہی کامیاب ہے
رکھے ہیں جس نے آپ سے چاہت کے سلسلے

استن حنانہ رویا کبھی گڑگڑائے اونٹ
کس کس سے ہیں حضور کی الفت کے سلسلے

کب عقل و فہم پہنچے ہیں اوجِ حبیب تک
ہوں گے نہ ختم آنکھ کی حیرت کے سلسلے

اقصیٰ و سدرہ، دیکھیے قوسین کا مقام
سب ہیں مرے حضور کی رفعت کے سلسلے

محشر میں کیوں نہ پائیں شفاعت کی شفقتیں
احمد کی آل سے ہیں محبت کے سلسلے

میں نے پڑھی جو سیرتِ اصحابِ مصطفیٰ
دیکھے نبی سے فرطِ عقیدت کے سلسلے

یہ سہروردی، قادری، چشتی، تمام ہیں
آقا حضور آپ کی نسبت کے سلسلے

اب بھی اگر رضا کا ہے دامن بھرا ہوا
سب ہیں مرے نبی کی عنایت کے سلسلے

رضا اللہ حیدر

نعتؐ

دست بستہ ہیں جہاں سارے زمانے والے
کتنے اعلیٰ ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

سرِ محفل یہ جو رحمت کی گھٹا چھائی ہے
ایسا لگتا ہے کہ سرکار ہیں آنے والے

ہم غلاموں کا وہ کیسے نہ بھرم رکھیں گے
وہ تو دشمن کی بھی ہیں لاج نبھانے والے

مجھ کو دنیا کے سہاروں کی ضرورت کیا ہے
میرے آقا ہیں مری بات بنانے والے

کٹ کے شبیرؓ نے کربل میں کیا ہے ثابت
اس طرح وعدہ نبھاتے ہیں نبھانے والے

دل تڑپتا ہے مرا بے سروسامانی پر
قافلے جب بھی مدینے کو ہوں جانے والے

میرے اشکوں کی سلامی بھی خدارا لے جا
اے مدینے کی طرف شوق سے جانے والے

دیکھتا رہتا ہوں میں چشمِ عقیدت سے انہیں
شہرِ محبوب سے آتے ہیں جب آنے والے

ہجرِ طیبہ میں سرِ عام نہ رو اے نادان
ایسے موتی نہیں مٹی میں ملانے والے

ہم گنہ گاروں کو محشر کا ہو کیا ڈر فیضان
آپ ہیں دامنِ رحمت میں چھپانے والے

فیض رسول فیضان

نعتؐ

زمانہ اب بھی ہے دستِ سخاوت دیکھنے والا
رسولؐ اللہ کا حُسنِ عنایت دیکھنے والا

بِلا چُون و چرا ایمان لے آیا نبوّت پر
شہِ ابرار کا طرزِ محبت دیکھنے والا

زباں میری، صدا میری، کرم اُنؐ کا، عطا اُنؐ کی
مری نعتوں کا ہے رنگِ عقیدت دیکھنے والا

جِدھر پاؤں اُٹھیں منزل کے رستے کُھلتے جاتے ہیں
شہِ دِیں کا ہے اندازِ قیادت دیکھنے والا

بَلا کی تیرگی میں بھی وہ رستہ دیکھ سکتا ہے
سفر میں آپؐ کا نورِ بصارت دیکھنے والا

غلامِ مصطفےٰ ہوں، اُن کے در کا میں گداگر ہوں
مرے جذبوں کو ہے وہ ربِّ عزّت دیکھنے والا

مسلماں ہوں مرا ایمان ہے ختمِ نبوّت پر
تو حیرت میں ہے گم امرِ مشیّت دیکھنے والا

خطا کاروں کو بھی وہ بخشوائیں روزِ محشر میں
مرے آقاؐ کا ہے حُسنِ شفاعت دیکھنے والا

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

دعا ہے میں بھی مدینے کی وہ فضا دیکھوں
زمانہ جس سے ہے روشن وہ در کھلا دیکھوں

میں پہروں گنبد خضریٰ کے سامنے بیٹھوں
میں بیٹھوں اور وہ معمورۂ ضیا دیکھوں

مدینے میں بھی پہنچ جاؤں میری خواہش ہے
میں اپنی آنکھوں سے وہ دل کا مدعا دیکھوں

میں اُن ہواؤں میں گلیوں کی دھول بن کے اڑوں
اور اس دیار میں پھر ان کے نقشِ پا دیکھوں

یہ آرزو ہے مری گلشن مدینہ سے
جو لے کے آئی ہے خوشبو میں وہ صبا دیکھوں

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرخ ہوئے، پھر نور نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکسِ جمال یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

اے خُدا

تُو ہی ہمارا مونس و غم خوار اے خدا
تُو ہی ہمارا یار و مددگار اے خدا

اپنا کوئی عمل نہ سخن اپنے حق میں ہے
ہم ہیں ترے کرم کے طلبگار اے خدا

زیرِ قدم تھے دشت و جبل ، بحر و بر کبھی
دریا ہی اَب ہمارے نہ کہسار اے خدا

صرف اِس لیے کہ امتِ احمدؐ میں ہے شمار
دُنیا ہے ہم سے برسرِ پیکار اے خدا

اِک ہم ہی اشکبار نہیں ہیں بغرضِ عفو
روتے ہیں شہر کے در و دیوار اے خدا

بخشش کے واسطے ترے در پر جھکے ہیں ہم
کوئی نہیں ہے خوبیِ کردار اے خدا

کوئی ہنر نہیں ہے بجز عجز و انکسار
حاضر ہیں ٹوٹے پھوٹے یہ اشعار اے خدا

کچھ مانگتے نہیں ہیں ترے در سے ہم فقیر
جز ایک دُرِّ طالعِ بیدار اے خدا

خاور اعجاز

عقیدت

دل اگر ذِکر سے غافل ہو جائے
زندگی قبر میں داخل ہو جائے

میں تری یاد میں روؤں کسی شب
پھر یہ رونا مرا کامل ہو جائے

یہ جو طوفان ہے میرے اندر
چاہتا ہوں کبھی ساحل ہو جائے

میں تری سمت چلوں اور مرے رب!
کوئی رَستے میں نہ حائل ہو جائے

نیند آ جائے درِ بخشش پر
خوف کا سلسلہ زائل ہو جائے

ایک مُسکان مجھے دیکھے سے
ایسا ہو، زیست میں شامل ہو جائے

وہ بھی دن آئے ہر اک حرفِ دعا
ترے ایجاب کے قابل ہو جائے

تیرا ہی نام رہے وردِ زباں
تو ہی تو حاجتِ سائل ہو جائے

آنکھ بِینا ہو تو ایک اک مُنکر
تری توحید کا قائل ہو جائے

تو اگر بھیک نہ دے جانِ انیس!
زندگی صیدِ مسائل ہو جائے

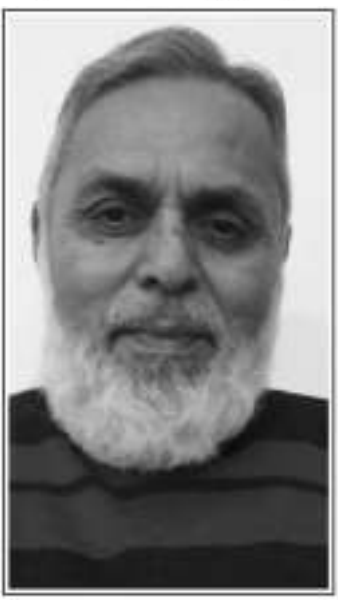

محمد انیس انصاری

لا الہ الا اللہ

دین ہے؟ کہ دین افزا: لا الہ الا اللہ
نور ہے محمدؐ کا لا الہ الا اللہ
ہر امان کا مصدر، پاک و طیب و اطہر
نسبتِ محمدؐ کا سا: لا الہ الا اللہ
علم کی عبارت میں، حرف کی حقیقت میں
ہیں محمدؐ اور معنیٰ: لا الہ الا اللہ
بابِ عشق کا عنواں، شمعِ محفلِ یزداں
ہیں محمدؐ اور اعلا لا الہ الا اللہ
فخرِ صفحۂ فطرت نازِ خامۂ نعمت
ہیں محمدؐ اور لکھا لا الہ الا اللہ
عہدِ نصرت و ایماں جس پہ ہر نبی نازاں
ہیں محمدؐ اور ایفا: لا الہ الا اللہ
شانِ قدرت داور، چشم و دل میں زیبا تر
ہیں محمدؐ اور القا: لا الہ الا اللہ
کیا ہی اُس کا ہے احساں! وجہِ بخشش انساں
ہیں محمدؐ اور بخشا لا الہ الا اللہ
لب پہ، یہ کرم ہے کیا! حرف میں زرِ معنیٰ
ہیں محمدؐ اور آیا لا الہ الا اللہ
کنزِ مخفیِ عرفاں کی نمود کا قرآں
ہیں محمدؐ اور اِفشا: لا الہ الا اللہ
اے مسافرِ منزل! سب کے رہبرِ کامل
ہیں محمدؐ اور رستہ: لا الہ الا اللہ
وہ بہارِ حق جس سے گل کھلے محامد کے
ہیں محمدؐ اور روضہ: لا الہ الا اللہ
حق عیاں تو ہونے دو جان لو گے تم لوگوں!
کون ہیں محمدؐ کیا؟ لا الہ الا اللہ
ہر رسول کے لب پر ہر پیام کے اندر
مژدۂ محمدؐ تھا: لا الہ الا اللہ
در کوئی ہدایت کا اب نیا نہیں کھلنا
ہے در محمدؐ وا: لا الہ الا اللہ
ظلمتیں ہوں جیسی بھی، دو ہی نور ہیں ہادی
یا ہیں ضو محمدؐ یا لا الہ الا اللہ
اُن سے ئے کوئی پہلے ایسا اور نہ بعد اُن کے
جیسے ہیں محمدؐ با لا الہ الا اللہ
غم ہو یا طرب، اے دل! سازِ جاں پہ ہر محفل
نغمۂ محمدؐ گا! لا الہ الا اللہ
اے لبِ سخن! جا کے عشق کے مدینے سے
مدحتِ محمدؐ لا: لا الہ الا اللہ
جانِ دعوتِ ایماں شانِ صورتِ ایماں
ہیں محمدؐ اور اِحیا: لا الہ الا اللہ
آصف! آج کیوں بیٹھے؟ ہم اگر سبھی چلتے
از رہِ محمدؐ تا لا الہ الا اللہ

مرزا آصف رسول

دل والے

کیسے عجیب لوگ ہوتے ہیں دل والے بھی کسی سے کچھ نہیں کہتے وہ تو اکثر یہی کہتے ہیں۔

''سہنے والے کو اگر صبر آ جائے تو کہنے والے کی اوقات دو کوڑی کی رہ جاتی ہے،،

ایسے چاہنے والے بڑے دِل والے بڑے جگر والے ہوتے ہیں دُھن جگرا ہوتا ہے ان لوگوں کا کہ کبھی شکوہ اور شکایت زبان پر لاتے ہی نہیں یہ کسی کو کچھ نہیں دیتے سوائے محبت کے یہ کسی سے کچھ نہیں لیتے سوائے محبت کے ہزاروں لاکھوں طعنے سنیں گے مگر برداشت کریں گے۔

اِن کا دِل پہاڑوں جیسا ہوتا ہے ایسے پہاڑ کوہ ہندوکش اور کوہ قراقرم جیسے کہ صدیوں سے اپنی جگہ کھڑے ہیں سب کی سنتے ہیں کبھی اپنی بات کسی سے کہتے ہی نہیں انسان اِن کے اندر ڈائنا مائیٹ فِٹ کر کے اِن کا سینہ چیر ڈالے پھر بھی خاموش رہتے ہیں دِل والے جو ہوئے۔ دل والے دِل میں ملال نہیں رکھتے۔ دُشمنِ جاں کو بھی حرزِ جاں نہیں بناتے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں کبھی ماتھے پر بَل تو لاتے ہی نہیں کبھی افسردہ ہوتے ہی نہیں دِل والوں سے بھی یہی کہتے ہیں۔ دِل تو کہتا ہے افسردہ ہو شاید تو بھی دِل کی کیا بات کریں دِل تو ہے ناداں جاناں ان کا تو موقف ہی نہیں ہوتا ہے کہ دنیاوی مال و متاع کی اِن کے ہاں نہ ہی کوئی وقعت ہوتی ہے نہ ہی کوئی حیثیت انھیں مسند کی نہ ہی ضرورت ہوتی ہے نہ ہی حاجت انھیں اختیار چاہیے نہ اقتدار بلکہ وہ تو اہلِ اقتدار کے پاس جانے سے بھی کتراتے ہیں۔ دِل ہو تو دلداری آ ہی جاتی ہیں جیسے کہتے ہیں کہ خدا جب حُسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے ہر دم رب پر راضی رہنا اِن کا شیوہ ہے۔ حالات کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں وہ اپنے رب پر حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور انھیں یقین ہوتا ہے کہ محبوبِ حقیقی ان کا ساجن بھی ہوتا ہے اور خیر خواہ بھی اس کے باوجود انھیں دنیاوی کسی رنگ میں کوئی تکلیف یا اِبتلا اور درد کی کیفیت سے گزرنا پڑا تو تکلیف ہوتی

سلیمان عبداللہ ڈار

ہے مگر دُکھ نہیں پریشانی نہیں پشیمانی نہیں کہ دِل والوں کے جہاں میں دُکھ کا گزر ہی نہیں محبتوں میں سُکھ ہی سُکھ ہوتا ہے بس جو مالک ہے خالق ہے وہی محبوب ہو تو وارے نیارے جو معبود ہے وہی محبوب ہو تو اور کیا چاہیے دنیا اور آخرت کی ساری کی ساری دولتیں خزانے ہی مل گئے کہ اس کا کرم جو شاملِ حال ہو گیا۔

"کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے"

.....

تعلق کی پائیداری ہو تسلسل ہو استقامت ہو تو دِل والے دِل کی باتیں دِل ہی دِل میں کرتے ہی رہتے ہیں اور یہ کوئی مشکل بھی نہیں اس میں تردّد بھی نہیں اس کا اہتمام کرنا بھی نہیں پڑتا دل میں ہی دلدار ہوتا ہے جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا دِل کا گھر یادوں سے باتوں سے ملاقاتوں سے ذکرِ یار سے تلاوت سے سجدوں سے کسی مفلس کی مدد کرنے سے کسی غریب طالب علم کی فیس ادا کرنے سے کسی غریب پڑوسی کے گھر خوشبودار کھانا پہنچانے سے کسی کی داد رسی سے کسی مظلوم کی مدد سے کسی مفلس کی بیٹی کا رشتہ اپنی ذمہ داری پر طے کروانے سے کسی کو چھت مہیا کرنے سے آباد ہوتا ہے پھر دل والوں کے دل کو یکتائی حاصل ہوتی ہے کہ جو یکتا تھا اس میں آ کر آباد ہو گیا اور دوئی ہے ہی نہیں نہ ہی اس کا خطرہ ہے اب اس دِل کی صفائی ہو گئی اس میں اب دنیا اور دنیاداری والی محبتوں کا اندیشہ ہائے سو دوزیاں کا ملبہ اور کانٹھ کباڑ آ ہی نہیں سکتا کہ یہاں محبتوں کے چمن گُل و گلزار ہیں دل کی زمین آباد ہے تو بانجھ پن کہا سے آئے گا اب یہ زمین (بس التجا کریں) بنجر نہ ہو تو الفت کی کھیتیاں ہی کھیتیاں اس میں لہلہائیں گی کہ یہ محبتوں اور عقیدتوں کی ایسی فصلیں ہیں کہ جن کی جتنی کٹائی کرو یہ اتنی ہی اور بڑھتی ہیں۔دل میں دل رُبا دوں کا ذکرِ اللہ کا یہ قافلہ اب مدینے والی گاڑی پر سوار ہو گا تو منزل پر پہنچے گا دِل بیدار کراری اور دِل بیدار فاروقی کے حامل لوگوں کو ہر پل یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ دِل زندہ نہ مر جائے کہ زندگی اس کے جینے ہی سے عبارت تھی عبارت ہے طعنے ہوں یا دشنام طرازی وہ اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے کہ۔دنیا والے دِل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں۔

جو ساجن کا ہو جائے پھر نہ اسے کوئی محرومی کا احساس ہوتا ہے نہ ہی تکلیف نہ کچھ چھن جانے کا خوف نہ ہی کوئی آہ و بکا پیار کی راہ پر جان دینا پڑے تو بھی تیار کہ یہ جسم و جاں بھی تو محبوب حقیقی کے دیئے ہوئے ہیں تو جس نے دیئے ہیں اسی کے لئے قربان کر دینا کون سی بڑی بات ہے بڑی بات تو تب ہوتی کہ انھیں قربان کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی محبت کی راہوں پر لٹانا ہوتا کہ یہ

راہ اور اس کی چاہ ایسی ہے کہ کوئی سا اسلوب، فکر و خیال کی کوئی سی زبان دانی کا کوئی بھی انداز نثر یا شاعری کا کوئی بھی پیرا یہ اس حقیقت کو بیان کرنے کا کوئی بھی افسانوی انداز اور پیار بھرے اس دل کی کوئی بھی داستاں گویا ان کیفیات کو ادا کرنے یا اس کا اظہار کرنے سے قاصر ہے کہ الفاظ ان جذبات احساسات کو اس تڑپ کو کیسے بیان کریں گے ان سوچوں بھرے سوز و گداز والے لمحات کا ترجمہ کیسے کریں گے جو دل والے محسوس کرتے ہیں کہ ایسا دل صرف ایک تمنا ایک التجا کرتا ہے۔

نال سجن دے رہیئے
جھڑکاں جھباں تے تقصیراں سو بھی سر تے سہیئے
جے ہر کٹ لین دھڑ نالوں تاں بھی آہ نا کہیئے
چندن رُکھ لگا وچ ویہڑے روز دھگانے کہیئے
کہے حسینؒ فقیر سائیں وا رب وا تا سہیئے

....

سینے میں دل ہو گا دل میں درد ہو گا درد لا دوا ہو گا تو عشق بنے گا پھر زیست کا بھی مزا آئے گا یہ دردی سینہ چاکانِ چمن کو اور ان کے دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کرے گا اور حریم کبریا سے آشنا کرے گا یعنی منزل پر لے جائے گا منزل تو وہی ذات کبریا ہے جو اپنی ہے اور ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟ سب کچھ اسی کا ہے دیا ہوا ہے دل بھی کیا شے ہے سینے میں یہ آنکھ دل کی آنکھ روشن ہوئی تو سب دلچسپیاں ہی بدل گئیں سارا تن من ہی آنکھ بن گیا جس میں ساجن سما گیا اس کی دید کی آس اُڈیک اک ہوک بن کر ہر ہر مسام پر ٹنگی ہوئی آنکھ میں التجا بن کر تیرنے لگی اب اس کے ساتھ فرائض کی ادائیگی اور پابندی بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہے کہ دراصل ولائیت حقہ شریعت ہی کے راستے سے آتی ہے شریعت میں تھوڑی سی چاہت ملا لیں تو وہ طریقت بن جاتی ہے اب خواہش کی وہی چاہت جو زر و جواہر کے لئے تھی جو اقتدار اور اختیار کے لئے تھی اب محبوب حقیقی کے لئے ہو گی اب رواں رواں آنکھ بن کہ محبت کی راہوں کو دیکھے گا۔ حکم ماننے کو بندگی کہتے ہیں جب جسم و جاں کے ہر مسام میں محبت رچ بس گئی تو حکم ماننا آسان ہو گا جس سے اعمال پیدا ہوں گے اور عمل کرنے والا کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہو سکتا وہ نوافل ادا کرے گا یہ نوافل اسے فرائض پر مائل کریں گے فرائض علم حاصل کرنے پر اکسائیں گے۔ محبت کرنے والا خود کو اگر بے علم سمجھے گا تو بھی علم حاصل کرنے والی لگن علم کی پہلی سیڑھی ہو گی عقل کے اندر کسی بات کا آ جانا اور پھر محفوظ ہو جانا علم کہلاتا ہے علم اور محبت کا جوڑ اہلِ دل کو اوجِ ثریا تک پہنچاتا ہے جہاں جنت الفردوس عطا ہوتی ہے اور اس میں اللہ جل شانہ بندے کی خواہش پوری کرتے ہیں حتیٰ کہ اسے اپنے رب کا سلام آتا ہے مخلوق ہو کہ خالق سلام والی منزل پر آ جانا بندے کی معراج ہے اس سے بڑی اور خوش قسمتی کوئی کیا ہو گی؟

☆☆☆☆☆☆

دائرے میں قدم

''دائرے میں قدم'' خالد علیم کا ناولٹ ہے۔ اردو میں ناولٹ کے حوالے سے بہت سا الجھاؤ ہے اور ناولٹ کی کوئی واضح تعریف موجود نہیں۔ بنیادی طور پر ناولٹ ایک طویل کہانی ہے، اس تخصیص کے ساتھ کہ افسانے کے برعکس اس کا موضوعاتی پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور معنوی دائرہ بھی مکمل ہوتا ہے؟ یعنی کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ''دائرے میں قدم'' کو ناولٹ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

خالد علیم نے ''کہانی سے پہلے'' کے عنوان سے جو مختصر دیباچہ لکھا ہے، اس میں اختصار سے ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ اس کا یہ کہنا درست ہے کہ ''کہانی کا بنیادی عنصر وہ سراب ہے جو اس کے مرکزی کردار کو واحد متکلم کے طور پر رایگانی کے صحرا میں گم کر دیتا ہے۔'' کتاب پر درج ناسخ کے شعر نے رایگانی کے اس صحرا کی جس معنوی اور فکری جہت کی طرف اشارہ کیا ہے وہی اس ناولٹ کی ہمہ جہتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار تشکیک سے یقین اور یقین سے جس تشکیک کے درمیان سرگرداں ہے وہ بطور کردار اس کی نشوونما اور پہچان ہے۔ پوری کہانی میں ایک اسرار اور تحیر ہے جو قاری کو ایک دھیمے مگر اثر انگیز حظ سے ہم کنار رکھتا ہے۔ بظاہر کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں لیکن زیریں تہ میں جو پُرکاری ہے، اس نے اس میں دل چسپی کے کئی رنگ پیدا کر دیئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ کہانی خود کو پڑھواتی ہے اور اسے شروع کر کے ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

خالد علیم کی اس بات سے اختلاف کی گنجائش ہے کہ اسلوب کی تمثیلی صورت اور پیچیدگی یا علامتی انداز، اظہار کو الجھا دیتا ہے یا تاثر میں کمی کا سبب بنتا ہے۔ علامتی انداز تو اس کہانی میں بھی موجود ہے لیکن بیانیہ سادہ ہے۔ سادہ بیانیہ کا بھی اپنا ایک حسن ہے اور وہ علامتی انداز کے برعکس زیادہ فنی جمالیات کا تقاضا کرتا ہے۔ تخیل اور حقیقت کے درمیان توازن کسی مخصوص اظہار سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس پُرکاری اور فنی مہارت کا متقاضی ہے جو لکھنے والے کی فنی گرفت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہانی بیان کرنے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، بنیادی بات فنی جمالیات اور فنی ریاضت کی ہے۔ خالد علیم نے اپنے تئیں سادہ بیانیہ کا سہارا لیا ہے لیکن یہ بیانیہ اتنا سادہ بھی نہیں۔ اسے نیم علامتی کہا جا سکتا ہے۔

کہانی کے واقعات معروضی ہیں لیکن بنیادی کردار کے مسائل معروضی نہیں بلکہ داخلی کشمکش کی وجہ سے اس کی بے چینی اور کچھ جاننے کی خواہش اسے ایک ایسے سفر پر لے جاتی ہے جو رایگانی کے صحرا میں چلا جاتا ہے؟ لیکن سوالات تو سارے سفر میں موجود ہیں۔ ان کے جواب ملتے ہیں یا نہیں، یہی دھندلکا اس کہانی کی خوب صورتی ہے۔ تکمیل اور نا تکمیل کے درمیان جو ایک بے نام اور نامعلوم راستہ ہے، ساری کہانی اور اس کا مرکزی کردار اسی راستے پر اپنا سفر کرتا ہے اور اپنے ہی سوالوں کا دکھ اُٹھاتا ہے؟ اور پھر اس دُکھ سے لطف بھی لیتا ہے۔

خالد علیم کے سادہ بیانیہ میں ایک روانی ہے۔ انھیں لفظوں کے استعمال اور ان سے ایک مخصوص صورتِ حال میں کیفیت پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ ساری کہانی روانی سے خود کو پڑھواتی ہے اور اچھے فکشن کی یہ بنیادی خوبی ہے۔

☆☆☆☆☆

رشید امجد

خالد علیم کی نعت نگاری

خالد علیم کی نعت کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک پرزم (منشور مثلثی) کی مثال کو سامنے رکھنا مناسب ہوگا۔ جس طرح پرزم کے تین رخ ہوتے ہیں، جن میں سے روشنی کی شعاعیں گزر کر مختلف رنگوں میں منقسم ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی طرح خالد کے فن شعر گوئی میں بھی تین نمایاں رخ دیکھے جاسکتے ہیں جن میں سے گزر کر ان کی شاعری کی تین بنیادی خصوصیات کئی ایک محاسن میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اس منشور مثلثی کا ایک رخ اگر تاریخی شعور ہے تو دوسرا عصری بصیرت اور جدت آہنگ، جب کہ تیسرے رخ کو فنی بالیدگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے---

تاریخی شعور فی الحقیقت وہ ڈوری ہے جو حال سے ماضی کے تعلق کو پائیدار اور مضبوط تر بناتی ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان شعرا میں اس شعور کی خاصی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ گویا وہ ایک کشتی میں سفر تو کر رہے ہیں لیکن سفر کی سمت کا تعین کرنے سے معذور ہیں اور سمت کا تعین اس لیے مشکل ہے کہ منزل سے ناآشنا ہیں اور ان کی اس منزل ناشناسی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھیں صرف آگے کی سمت جما رکھی ہیں---اور آغازِ سفر سے ناآگاہ منزلِ سفر سے کیسے آشنا ہو سکتے ہیں---!

خالد علیم کی یہ خوبی انھیں اپنے دیگر ہم عصروں سے اس طرح ممیز کرتی ہے کہ انھوں نے اپنی گاڑی کا بیک ویو مرر (BackView Mirror) صاف رکھا ہے، چناں چہ ان کی آنکھیں جہاں سامنے پھیلے ہوئے راستے پر محوِ سفر ہیں، وہاں گزرے ہوئے راستے پر بھی مرتکز ہیں۔ یوں تو تاریخ سے آگاہی ہر معاملے میں رہنما ثابت ہوتی ہے، لیکن نعت کے سفر میں اس کو رختِ سفر کی طرح ساتھ رکھنا، نہ صرف ضروری بلکہ لازمی قرار پاتا ہے---

خالد علیم کی نعت جہاں ہم پر قصرِ تاریخ کا باب تلمیح وا کرتی ہے، وہاں مدحت کے آفاق پر سیرت نگاری کے ستاروں سے جگمگاتی کہکشاں کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ خالد علیم کی نعت نگاری سیرتِ نبویؐ کے جواہر سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ حضورؐ کا خلقِ مبیں، حضورؐ کی عظمتِ کردار، آپؐ کا حسنِ نگاہ اور آپؐ کی بوریہ نشینی سیرت طیبہ کے چند ایسے درخشندہ پہلو ہیں، جن کے اثرات معجزانہ نتائج کے حامل قرار پائے---

خالد علیم نے ''سورۃ والضحیٰ کی شانِ نزول'' نظم کر کے تاریخِ اسلام اور قرآن سے اپنی گہری

حامد یزدانی

وابستگی اور لگاؤ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا نعتیہ قصیدہ "محامد" بھی اپنے دامنِ تاریخ کے متنوع رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ ان تخلیقات میں خالد کا تاریخی شعور ان کی عصری بصیرت کے ساتھ محوِ سفر دکھائی دیتا ہے۔ عصری بصیرت درحقیقت تاریخی دروں بینی ہی کا ایک پرتو ہے--- تاریخ کا ایک اچھا طالب علم جب ماضی کو حال سے مربوط کر کے دیکھتا ہے تو دراصل وہ تاریخی تناظر کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ کسی بھی اہم شخصیت کو تناظری تجزیے کے بغیر عہد ساز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضور نبی کریم کی ذات گرامی اس تناظری تجزیے میں ایسی عہد ساز شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے، جس کا عہد روزِ ازل سے دورِ ابد تک بسیط ہوتا چلا جاتا ہے---

خالد علیم کی عصری بصیرت نے اُن کے تاریخی شعور ہی سے جنم لیا ہے، لہٰذا مضبوط تاریخی شعور کی بنیادوں پر قائم عصری بصیرت کی عمارت کیوں کر قابلِ اعتماد نہ ہوتی---! خالد جب اپنے تمام تر تاریخی شعور کے ساتھ عصری بصیرت کے منبر (Pedestal) پر سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کے کلام میں جدت آہنگ کے استعارے مہ و انجم کی طرح جھلملاتے نظر آتے ہیں---

سب سے بڑھ کر جو شے خالد علیم کو دیگر نوجوان شعرا میں ممتاز کرتی ہے، وہ فنی بالیدگی ہے۔ نعت قصیدے کے روپ میں ہو یا آزاد نظم کے پیرایے میں، اوزان عام ہوں یا رباعی کے، خالد علیم نے ہر صنف اور ہر بحر میں اپنی بھرپور فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ نعت چوں کہ حضورؐ کی تعریف و توصیف ہے، اس لیے خالد اسے بنیادی طور پر قصیدے ہی کے قریب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے نعتیہ قصائد کے علاوہ دیگر نعتوں میں بھی --- قصیدے کا آہنگ اور لب و لہجہ غالب نظر آتا ہے--- اس لیے جہاں ان کی نعتوں میں قصیدے کی فضا اور ویسی ہی شوکتِ الفاظ نظر آتی ہے، وہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان کی اکثر نعتیں غیر مردّف ہیں اور وہ ان میں قصیدے کی سی روانی اور تسلسل کے ساتھ شعر کہتے چلے جاتے ہیں، جب کہ اُن کی مردّف نعتوں میں اس کمال کا صوتی آہنگ موجود ہے کہ پڑھتے ہوئے وجدان ایک عالمِ کیف میں کھو جاتا ہے---

خالد علیم کے بارے میں محض یہ کہنا کہ ان کے ہاں اچھی شاعری کے امکانات موجود ہیں، ناانصافی کے مترادف ہوگا کیوں کہ ان کے ہاں تو ایک کامل شاعر موجود ہے۔ رہی بات نعت کہنے کی، تو یہ ایک سعادت ہے اور حق ادا کرنے کی کوشش۔ ہر شاعر اپنے طور پر بہ طریقِ احسن حقِ نعت گوئی ادا کرنے اور اس سعادت کے حصول کی سعی کرتا ہے۔ شرفِ قبولیت تو اسی کو حاصل ہوتا ہے جس کی نعت ممدوح کو بھا جائے، اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خالد نے حضورؐ پاک سے جس والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہ حضورؐ عالی مقام، رحمۃ اللعالمینؐ کی چشمِ الطاف و کرم سے محروم نہیں ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

خالد علیم کی غزل

سجاد باقر رضوی کے نزدیک فرد، معاشرے میں رائج اقدار و معیارات، اور شعری روایت..... یہی وہ تین بڑے عناصر ہیں جن کے باہمی ٹکراؤ اور کشمکش سے شاعری ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس ٹکراؤ اور کشمکش کی Intensity ہی شعر کے مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے - جس قدر یہ Intensity زیادہ ہوگی، شاعری بھی اُتنی ہی بڑی اور اہم شاعری کی جانب سفر پر گام زن ہوگی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر یہ ٹکراؤ اور کشمکش عمل پذیر ہوتے کیوں ہیں۔ معاشرے کی ضروریات کچھ اور ہیں تو فرد کی ضروریات کچھ اور، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں کی ضروریات باہم متصادم ہوتی ہیں۔ یہ تصادم کوئی ہم آپ سے مشروط نہیں، رُوے زمین پر انسان کے قدم پڑتے ہی اس کشمکش کا آغاز ہوگیا تھا۔ بس یوں ہے کہ تصادم کی شدت کم یا زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جارہی ہے۔

اب اس ٹکراؤ کے خاتمے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس ٹکراؤ کا خاتمہ اسی صورت ممکن ہے جب معاشرہ اور فرد دونوں میں سے کوئی ایک کمپرومائز کر لے، سمجھوتا کر لے اور ماہرین عمرانیات کے بقول سمجھوتا معاشرہ کبھی نہیں کرتا، یہ سمجھوتا ہمیشہ فرد ہی کو کرنا پڑتا ہے، اور اس سمجھوتے کے نتیجے میں فرد کو اپنی خوشی اور اپنی آزادی کی قربانی دینا پڑتی ہے:

نکل پڑا جو حصارِ بدن سے طائرِ جاں
ٹھہر گئی مری تعمیرِ آشیانہ غلط

باغ کا باغ تو، اے جبرِ مسلسل! نہ مَسل
اَن کھلے غنچوں میں کھلنے کی اَدا رہنے دے

اپنا یہ دامِ تعلق نہ بڑھا میری طرف
میری آواز کو کچھ دن تو رِہا رہنے دے

نوید صادق

جب اُس چراغ کی لو کھینچنے لگی دل کو
ہوا کی سِفلہ مزاجی نے گرم جوشی کی

میں زخم زخم کفِ خار پر سمٹ آیا
زبانِ گل نے مرے حال پر خموشی کی

دل ایک سنگِ سیہ تھا مگر زمانے نے
بڑے جتن سے اسے روشنی میں ڈھالا ہے

اک بے خبری میں نکل آیا تھا میں گھر سے
دیکھا تو کہیں اور ہوا لے گئی مجھ کو

جانا تھا کہیں اور ، ٹھہرنا تھا کہیں اور
لیکن یہ کہاں خلقِ خدا لے گئی مجھ کو

اب تک نہ چلا اور نہ آیندہ چلے گا
دستور کوئی شہر میں سلطانیٔ دل کا

.....

شہر میں سلطانیٔ دل کا زمانہ کبھی آیا ہے نہ آپائے گا۔ فرد کے معاشرے سے سمجھوتے کے بعد بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ سب درست سمت میں گام زن ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اندر ہی اندر معاشرے میں بگاڑ کی جڑیں زور پکڑتی چلی جاتی ہیں اور... اور کیا:
کسے خبر ہے کہ اندر سے کتنے ٹوٹ چکے
تماشا گاہ سے آئے جو آج ہارے ہوئے

یہ کم ہی کیا ہے کہ زندہ ہے آج بھی خالد
جو پوچھے کوئی، کہنا اُسے کہ ہاں خوش ہے

.....

فرد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے۔ مغائرت اپنے جلوے دکھانے لگتی ہے۔ فرد اکلاپے کا شکار ہوتا ہے۔ اسے اپنے اردگرد کے لوگ یا تو اپنے آپ سے لاتعلق نظر آنے لگتے ہیں یا پھر اپنے دشمن۔ انسان اپنے آپ کو بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن کسی خرابی یا کمی کو محض محسوس کرنا..... اس راستے کا اختتام مختلف ذہنی امراض پر ہوتا ہے لیکن ان خرابیوں کی طرف اشارہ، ان خرابیوں کے اسباب کا تجزیہ، ان خرابیوں کے باعث پیدا شدہ صورتِ حال کی عکاسی، ان خرابیوں کی ترویج پر آواز بلند کرنا... ان کے تدارک کے راستے سجھاتا ہے، اور یہ سب شاعر کے لیے ایک طرح کا کیتھارسس کا عمل بن جاتا ہے اور بعد ازاں قاری بھی ان جملہ عوامل سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اپنے کیتھارسس کے قابل ہو جاتا ہے:
پہنچتی ہی نہیں کوئی صدا ہم زادگاں کی
یہ سناٹا ہے یا آواز دھوکا کھا رہی ہے

بلا کے حبس میں محبوس کر دیا گیا ہم کو
مکالمہ کبھی ہوتا نہیں ہوا سے زیادہ

مغائرت کا جو عقدہ کھلا تو یہ بھی کھلا
میں اپنے وقت کے لوگوں میں کم نکلتا تھا

ایک انبوہِ غم دنیا مرے دل میں بسا ہے
ایک دنیا کا سفر کرتا ہوں میں گھر میں اکیلا

میں نہیں خالد! کسی آواز کا یہ معجزہ ہے
اک دیا ہے اور ہے اس رات کے ڈر میں اکیلا

تم بھی ہو ایک آدمی، تم بھی تو خاک ہو
میرا بھی کچھ نسب ہے تمھارے نسب کے ساتھ

سفر اس رات کے جنگل میں یوں ہے زندگی کا
کہ جیسے شاہزادہ داستانوں میں اکیلا

ہم تو بس آئنہ پیمائی میں آ جاتے ہیں
گھر میں آتے ہیں کہ تنہائی میں آ جاتے ہیں

.....

خالد علیم جیسے افراد کے ساتھ کم و بیش اسی نوعیت کا معاملہ پیش آتا ہے۔ لیکن معاشرے کے تمام افراد خالد علیم نہیں ہوتے۔ مختلف شخصیات مختلف انداز میں ردِعمل کا اظہار کرتی ہیں۔ کہیں بغاوت سر اٹھانے لگتی ہے تو کہیں ذہنی امراض زور پکڑنے لگتے ہیں۔ لیکن خالد علیم کی شخصیت کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے... کیوں کہ تنقید میں بعض مکاتیب فکر کے نزدیک آپ شاعر کو اس کی شخصیت سے الگ نہیں کر سکتے۔ سو خالد علیم جیسے راست رو انسان کو معاشرے سے کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ یہ سوال اہمیت رکھتا ہے لیکن خاص پیچیدگی کا حامل نہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ جب لفظ ''معاشرہ'' ادا کیا جاتا ہے تو... صرف درست سمت میں گام زن افراد کا ٹولہ ہی سامنے نہیں آتا۔ اور زیادہ کھل کر بات کی جائے تو ہمارے ہاں معاشرہ کے طور اطوار خاصے زوال پذیر، ایک قدم آگے زوال شدہ حالت میں ہیں۔ وہ بنیادی جذبہ جو افراد کو معاشرہ بناتا ہے... دم توڑ چکا ہے:

اک دوسرے پہ اپنی نظر ہی نہیں رہی
کس حال میں ہے کون، خبر ہی نہیں رہی

.....

ایسے میں ایک راست روش انسان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ کیا وہ ایسے معاشرہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل پائے گا۔ ہرگز نہیں، لیکن ایسا شخص... ایسا حساس انسان اقدار کے مزار سے آنکھیں بند کیے نہیں گزر سکتا۔ ایسا انسان یہ سب دیکھ کر خاموش بھی نہیں رہے گا۔ جبھی تو... کوشش موجود ہے، ایک طرف قدیم سے ربط برقرار رکھنے کی اور دوسری طرف معاشرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی اور اسے درست روش پر گام زن کرنے کی:

عبس بے شک ہو مگر ذکر ہوا کا تو کریں
کم سے کم شہر کے بیمار تمنا تو کریں

دن میں رات کی چادر اوڑھی، سورج کو پیوند کیا
کرتے کرتے ہم نے ہر امکان کا رستہ بند کیا

.....

لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ جو معاملات پیش آتے ہیں اُن کا ادراک کسے نہیں ہوگا:

شکستِ ذات کا الزام تو نہ دو خالد
کہ ہم ہیں اگلی شکستہ صفوں کے مارے ہوئے

.....

خالد علیم کے ہاں جو اجتماعیت کی چھوٹ ہے اس کے ڈانڈے ان کی ذات سے معاشرے کے راستے اپنی قوم اور پھر انسانیت سے جا ملتے ہیں۔ آپ خالد علیم کو ان کے معاشرے، اُن کے ماحول، اُن کی قوم اور پوری کائنات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ فرد کو وجودیت کے عذاب سے نکال کر اجتماعیت کے سکون بخش دھارے میں شامل کرنے کے خواہاں ہیں۔ وجودیت، جس کا جدید انسان نے بہت پرچار کیا، ایک لعنت سے کم نہیں کہ انسان منتشر خیالی اور اضطراب کا شکار اسی نظریے کے کارن ہوا۔ وہ انسان کے پورے وجود کی موجودگی کے قائل ہیں۔ یوں بھی خالد علیم نظریہ سے زیادہ نظر کے شاعر ہیں اور یہ نظر اپنی ذات سے لے کر کائنات تک سب کچھ سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ پیہم اس کوشش میں نظر آتے ہیں کہ جو غلط ہے اسے درست روش پر گام زن کرلیا جائے لیکن جب کہیں کوئی بس چلتا نظر نہیں آتا تو:

یہ کیسی دھند ہے آفاق کے دونو کناروں پر
تری صورت کو مجھ پر آئنہ ہونے نہیں دیتی

اصول سب کا یہی ہے تو میں بھی سوچتا ہوں
جو میرے حق میں نہ جائے وہ کام کیوں کیا جائے

.....

میری کاوش میں کہیں کوئی خرابی ہے کہ ...
ایک شک کا عنصر سامنے آنے لگتا ہے۔ وہ جس کی خواہش، جس کی طلب ہے... ایک دھند،

ایک تشکیک اس منزل تک پہنچنے میں راستے کی رکاوٹ بنتی نظر آتی ہے۔ دل میں یہ خواہش کروٹیں لینے لگتی ہے کہ جس طرح دیگر افراد بھلی چنگی زندگی گزار رہے ہیں..... (مگر)..... خالد علیم کے لاشعور پر صرف ان کا اپنا بوجھ نہیں، انھیں تو صدیوں کا بار اٹھانا ہے:

میرے گزرے ہوئے کل! سانس تو لینے دو مجھے
میرے احساس کے پاتال میں چھل بل نہ کرو

میں نے خود کو ابھی اتنا بھی کہاں دیکھا ہے
میری آنکھوں سے مرا آئنہ اوجھل نہ کرو

یہ دل ہے اور اِسے سینہ بہ سینہ کھینچتے ہیں
اگرچہ ہم سے بہت یہ لہو کیا گیا ہے

اے مرا شہر کھودنے والے!
میں بھی کیا کل کی داستاں نہیں تھا

.....

اور اس سارے پر نگاہ دوڑانے کے بعد خالد علیم کے ہاں ایک احساسِ رائیگانی اپنے مربوط رنگ میں اپنا تسلط جمانے لگتا ہے۔ یہ احساسِ رائیگانی کہیں اجتماعی اور انسان کے کُل سفر کے حوالہ سے تو کہیں انفرادی احساس کی صورت اپنے خدوخال واضح کرنے لگتا ہے، ایسے میں نگاہیں فردا کی طرف اٹھتی ہیں کہ شاید اس لاحاصلی، اس رائیگانی کا کوئی تدارک ممکن ہو پائے:

کیا ڈھونڈ رہے ہو کفِ صحرا پہ مرا نقش
ہم رنگِ گلِ لالہ، نہ میں آبلہ پا ہوں

بادِ سحر افروز نہیں ہے مری آواز
ہاں گریۂ شب سوز کی دل دوز صدا ہوں

کھلتا ہی نہیں مجھ پہ کوئی قریۂ گل رنگ
اک عمر سرابوں کے تعاقب میں رہا ہوں

کسی جلتے ہوئے امروز کی لاحاصلی پر
نظر میں سایۂ امیدِ فردا رہ گیا ہے

.....

خالد علیم کے ہاں معاشرتی رویوں پر غور و فکر ملتا ہے۔ ان کے اشعار اپنے عہد کے منتشر اور مضطرب ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ انسان کے زوال کو اس کا اپنا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ بگاڑ فرد سے شروع ہو کر معاشرہ کے زوال کی صورت دھارتا ہے۔ فرد کا اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر لینا... معاشرے کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ فرد کی اپنی دانائی اس کی اجتماعی زندگی کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہو رہی ہے:

خود بھی آئینہ دیکھ لینا تم
شہر پر جب کوئی وبال آئے

مری بستی تباہی کی طرف کیوں جا رہی ہے؟
ابھی مجھ سے نہ کچھ پوچھو، مجھے نیند آ رہی ہے

وہ خرابی کہ جو بسیار ہوئی جاتی ہے
کام دکھلاتی ہے اس میں مری دانائی بھی

کس خرابی سے لیے بیٹھی ہیں پسپائیوں کو
بھاڑ میں جھونک دو اِس شہر کی دانائیوں کو

یہ دور اپنی حدوں سے گزرنے والا ہے
مگر کسی سے نہ کچھ ذکرِ ہاؤ ہو کیا جائے

.....

رہنماؤں کی بے حسی اور کج عملی اس سب پر مستزاد ہے۔ ان لوگوں کے اپنے مفادات ہیں۔ یہ ہمیں روشنی کی نوید دیتے ہیں لیکن ان کی برپا کی ہوئی سحر اس رات سے کہیں بھیانک ہوگی جس میں ہم مدتوں سے اسیر ہیں۔ سب دکھاوا ہے۔ دکھاوے کی روشنیاں انسان کا مقدر تبدیل نہیں کر سکتیں:

اندھیرے بانٹتا پھرتا ہے وقت کا سلطان
پناہ ڈھونڈتا ہے جشنِ آفتابی میں

بس یونہی سانس کی گرمی میں چلے جاتے ہیں
قافلہ تم نہ کوئی قافلہ سالار ہوں مَیں

چھین لے جائے گی قسمت میں لکھیں روشنیاں
ظلم کی رات جو پیغامِ سحر لائی بھی

سیاہ رات زمانے میں اور پھیل گئی
کہ روشنی کے امیں، تیرے استعارے ہوئے

صرف منظر سے کوئی کام نہیں چل سکتا
کتنا اچھا ہو، چلی جائے جو بینائی بھی

نہیں ہے کچھ بھی نظر کی شگفتگی کے سوا
کھلا جو آنکھ پہ خالد، نظارہ ایسا ہے

.....

ایسے میں انسان سہاروں کی تلاش کرتا ہے جن کے سہارے..... جن کے دھوکے میں زندگی

بسر کی جا سکے۔ زندگی کے حقیقی پہلوؤں سے گریز اور فرار کی راہیں سجھائی دینے لگتی ہیں لیکن یہ خوف بھی دامن گیر رہتا ہے کہ یہ دھند خدانخواستہ کہیں چھٹ گئی تو..... تو جو منظر ڈھل کر نکھر کر سامنے آئے گا، وہ خدا جانے کتنا ہیبت ناک اور کریہہ ہوگا:

اسیرِ حلقۂ مہتاب رہنا چاہتا ہوں
یہ رات ڈھونڈ نہ لائے مری سحر کا سراغ

.....

اور ایسے عالم میں..... ایسے کریہہ منظرنامے میں انسان کا اپنا وجود کہاں باقی رہ پاتا ہے۔ اور کچھ اس قسم کا احساس دل میں جگہ بنانے لگتا ہے:

نہ جاں مری جاں، نہ ذات میری، نہ دن ہی میرا، نہ رات میری
میں سارے اپنوں میں منقسم ہو کے رہ گیا ہوں کٹا کٹا سا

اور اب یہ صورت کہ صورتیں سب نگاہ سے ہو چکی ہیں اوجھل
کبھی کسی کے حضور میں چپ، کبھی میں خود سے الجھ پڑا سا

.....

اتنی بڑی کائنات میں انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟ لیکن اشرف المخلوقات کا درجہ بھی اسی انسان کو حاصل ہے، اور یہی انسان بے چارگی و بے بسی کا مرقع بنا بیٹھا ہے۔ ہم اس صورتِ حال کو ایک بڑے بلکہ سب سے بڑے انسانی المیہ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب اس کا باعث کون ہے؟ ایک باعث تو انسان خود ٹھہرا اور دوسرا..... اس موقع پر خالد علیم غزل کی مخصوص طبع کا سہارا لے کر کچھ بتا جاتے ہیں تو کچھ چھپا جاتے ہیں کہ ان کے اندر کا شاعر ان کے بنیادی عقائد پر ایک کاری ضرب لگانے کے درپے ہے۔ خیر خالد علیم کھل کر بات نہ بھی کریں تو ان کے اشعار اس سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہیں:

مری زمین پہ اب آدمی کا نام نہ لو
بڑے سلیقے سے بے آبرو کیا گیا ہے

زمیں کا دائرہ تنگ ہے مری دنیا
بس اک نظر ہی یہ لگتا ہے خاک دان کھلا

زمیں کی کوکھ سے کیا آدمی کا پوچھتے ہو
سو خاک ڈال کہ یہ خاک بھی ہے یوں کوئی دن

گزر رہی ہے جو اس میکدے پہ، جانتے ہیں
رُکے نہ ہاتھ تو پیمانہ وار گوں کیا جائے

چلو اس آئنہ خانے میں یہ بھی کافی ہے
کہ رکھا اس نے مرا عکس آئنہ نہ غلط

.....

اور فوراً ایک گلے کا سا انداز سامنے آتا ہے:

ہم وہی لوگ ہیں خزاں دیدہ
ہاں! اگر تجھ کو بھی خیال آئے

لیکن:

خالد یہ سوچتے ہی مرا ہاتھ رُک گیا
دیتے نہیں ہیں دستکیں خالی مکان پر

.....

البتہ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی اور اطمینان کی ایک صورت دکھائی دینے لگتی ہے:

چلو کہ یہ بھی غنیمت ہے دشتِ عریاں میں
نظر اُٹھی نہ غلط اور قدم پڑا نہ غلط

ڈھونڈ چکے سُو بہ سُو، دیکھ چکے کو بہ کو
جتنا ملا، جو ملا نام و نشاں، ٹھیک ہے

.....

خالد علیم کا "مَیں"... محض خالد علیم نہیں رہتا، پوری انسانیت کی آواز بن کر سامنے آتا ہے اور وہ ایک بار پھر اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں۔ انسان کہاں سے کہاں آن پہنچا، دیکھنے میں ترقی اور محسوس کرو تو تنزلی..... اعلیٰ انسانی اقدار کی پامالی کا نوحہ دھیان میں سر اٹھاتا ہے تو عظمتِ رفتہ کا شدید احساس اور اس عظمت رفتہ کی بازیافت کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے، فردا سے امیدیں وابستہ ہونے لگتی ہیں:

سُنتے آئے ہیں کہ دیوار تھی دیوار کے ساتھ
ہر مکاں دور تلک ایک مکاں تھا پہلے

ایک دَر کھلتا تھا، دَر کھلتے چلے جاتے تھے
کوئی ہم سایہ ہو، ہم سایۂ جاں تھا پہلے

کاندھوں سے اُتر کر باپ کے دو، پہلو میں کھڑے ہو جاتے ہیں
جب بچے بولنے لگ جائیں، خاموش بڑے ہو جاتے ہیں

جن شہروں کی آبادی میں احساس کی کوئی ریت نہ ہو
ان شہروں پر ویرانی کے میدان کھڑے ہو جاتے ہیں

خالد یہ باتیں ٹھیک نہیں، اتنا نہ الجھ تو لوگوں سے
صرف اپنے بڑوں کے مرنے سے کچھ لوگ بڑے ہو جاتے ہیں

جہانِ ہفت ورق کی کتاب کھول کے دیکھ
زمیں کا صفحۂ بوسیدہ بھی کوئی شے ہے

اپنے بس میں ہو تو جلدی سے زمیں پر لے آئیں
آسماں کی سحر آداب توانائیوں کو

کوئی وہ دَور بھی آئے گا، جب زمانے میں
نہ مجھ کو خوار، نہ تجھ کو کہیں زبوں کیا جائے

.....

اور اس وقت کی خواہش اور اس کے انتظار میں دوسرے انتظاریوں کے ہمراہ..... خالد علیم نے کیا خوب صورت شعر اُردو ادب کی گود میں ڈال دیے ہیں:

مَیں اسٹیشن پہ تنہا بھیڑ میں تنہا کھڑا ہوں
مسلسل، آخری گاڑی کی آواز آ رہی ہے

وہ شاید آخری گاڑی میں ہو گا
ذرا دیکھوں اُسے آتا ہوا مَیں

.....

خالد علیم کے ہاں "مَیں" جہاں بھی استعمال ہوا اجتماع کے لیے استعمال ہوا۔ لیکن پھر بھی چند ایک ایسی غزلیں ہیں جو شاعر کی اپنی ذات کا اظہاریہ ٹھیرتی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

کوئی ایسا ہے نہ ایسا مَیں ہوں
بس ذرا سا پسِ دنیا مَیں ہوں

کچھ یونہی سا کہ گماں ہو جیسے
کچھ یونہی سا کہ ذرا سا مَیں ہوں

سُر کوئی اور تو نغمہ کوئی اور
ایک بے وقت تقاضا مَیں ہوں

کہیں ہونا تھا مجھے ایک ہی بار
اک یہی بات کہ سمجھا مَیں ہوں

تم نہیں ہو ؟ نہیں تم ہو خالد!
نہیں اچھا ، چلو اچھا ، مَیں ہوں؟

.....

اس غزل کے مقطع کی بات کی جائے تو ایک بھرپور مکالمہ..... اپنے آپ سے مکالمہ ملتا ہے۔ خالد علیم کے ہاں مکالمہ کاری بہت مضبوط انداز میں سامنے آئی ہے: یہ خود کلامی کا رویہ خالد علیم کے ہاں ہمیں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس خود کلامی میں وہ اپنی ذات سے کہیں اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ یہ مکالمہ انسان کا مجموعی روپ دھار کر کرتے نظر آتے ہیں۔
خالد علیم کے ہاں پہلے مجموعہ کلام (شام، شفق، تنہائی) کے بعد یہ نہیں کہ مضامینِ محبت بالکل ناپید ہو گئے ہوں۔ ہاں یوں ہے کہ اب ان میں کیفیات و جذبات کی جگہ ایک سوچنے سمجھنے کا سا انداز در آیا ہے۔ حسین یادوں کے سائے ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے جذبوں میں ایک توانائی اور فکری عنصر شامل ہو گیا ہے، اور کہیں کہیں یہ زمینی محبت اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ حقیقت کا روپ دھارنے لگتی ہے۔ یہ موضوع خالد علیم کے ہاں بہت شدت کے ساتھ نہ سہی، درست اور پُرخلوص انداز میں سامنے آیا ہے:

کہاں کسی بھی نظر کا چراغ جلتا تھا
وہ چاند جب مری بستی میں آ نکلتا تھا

وہ ایک ایک پہ کھلتا گیا ، مگر اُس نے
تمام عمر مجھے رسم و راہ پر رکھا

وہ ایک چاند کہ جس نے مجھے ستارہ مثال
طلوعِ صبح تلک اشتباہ پر رکھا

داستانِ محبت کے انجام تک
دو ہی کردار ہیں ، آئنہ اور مَیں

ہم محبت میں اگر ہارے تو بس اتنا ہوا
رو دیے، دو چار دن آنسو بہائے اور بس

یہی دو چار دن تھے ہنسنے کے
تم نے خالد علیم عجلت کی

دل ملا بھی تو ملا کیا خالد
میر صاحب کے زمانے والا

فرصتِ ہجر کے لیے اتنی شدید ضد کہ بس
یاد ہے میرے ہاتھ کو زور تری کلائی کا

ایک دیوار ہے، دیوار کے اس پار بھی کچھ ہے
وہ ہے یا پھر کوئی ہونے کا گماں؟ کچھ نہیں کھلتا

پہنچا ہوں، جہاں تیری صدا لے گئی مجھ کو
کیا موج تھی، آئی تو بہا لے گئی مجھ کو

.....

اور یہیں کہیں سے ایک رستہ خود آگاہی کا میسر آتا ہے۔ اپنی پہچان... اور کیا مزے کی بات ہے کہ یہاں بھی خالد علیم انفرادی کم اور اجتماعی احساس سے زیادہ مالا مال ہیں۔ انسانی عظمت کا ادراک، خالق کو مخلوق کی طرف سے اپنی عظمت سے آگاہی کے اشارے، اور اس راہ پر مزید سفر کے امکانات کا بیان خالد علیم کی شاعری میں مثبت رویوں کو بڑھوتری دیتا ہے:

جہاں سے پھوٹ رہا ہے بہار کا چشمہ
مرے جنوں نے وہ صحرا بھی دیکھ ڈالا ہے

وہ ایک ذرّہ جو دشتِ سراب میں گم تھا
اب آسماں سے زیادہ بلند و بالا ہے

تجھ کو، خالد! اِک ترا ہونا ہی کافی ہے، مگر
لوحِ جاں پر دیکھنا، اس سے اگر بہتر کھلا

اتنے کھل کر بھی کھلتے نہیں یہ سبھی
کیا پُرسرار ہیں آئنہ اور مَیں

وہ جس سے آئنے پر عکسِ رفتگاں بھی کھلے
وہ خوے خود نگری تجھ میں ہے کہیں، اے 'ہے'

.....

بات بہت طویل ہوگئی اور میں تا حال خالد علیم کی غزل پر مکمل گفتگو نہیں کر پایا۔ مزید طوالت سے گریز کی صورت میں کتنے ہی ایسے اشعار بھی نظر انداز ہو گئے جو میرے اس مضمون کے متذکرہ موضوعات کا احاطہ کرنے میں نمایاں طور پر مددگار تھے مگر میں نے ان سے دانستہ گریز کیا کہ یہاں اُن کی شاعری کی یک قلم ایک جھلک پیش کرنا مقصود تھا۔ اس کے علاوہ، ابھی تو ان کی رباعیات، مختصر و طویل نظمیں، حمد و نعت، نعتیہ قصاید، مرثیہ، چھ سو اشعار کے لگ بھگ ایک ہی زمین میں طویل ''نعت نما'' اور مزاحمتی شاعری اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ ایک مضمون میں ان سب اصناف کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ صرف غزل ہی کو لیا جائے تو اس پر کئی اور ابعاد سے کئی پیرائیوں میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔ خالد علیم کی غزل کے فنی محاسن پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ اُن کے تلازمات پر بات ہو سکتی ہے۔ مختصراً یہ بھی بتاتا چلوں کہ خالد علیم کی غزل ہمارے عہد کی وہ منفرد و ممتاز غزل ہے جس کی جڑیں ہمارے روایتی شعری سرمائے میں پیوست ہیں۔ وہ روایت پر عمل پیرا رہ کر جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی روایت قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نئی روایت صرف الفاظ و معانی ہی کی جنگ نہیں کہ اس میں اپنے اور اپنے جیسے دیگر لوگوں کی آواز شامل ہے۔ وہ مستقبل کو بہت بہتر بنانا چاہتے ہیں لیکن اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے خالی ہوائی خواب محلوں سے کام نہیں چلنے کا، اس کے لیے ماضی اور حال دونوں کو نظر میں رکھنا ہو گا۔ ماضی میں کیا تھا، کیسا تھا، کہاں سب درست تھا، کہاں کیا غلط تھا..... جب تک ان کا ادراک نہیں ہوگا، حال میں تبدیلی اور فردا میں

جناب خالد علیم، جناب راز کاشمیری کے ساتھ۔

بہتری کے آثار موہوم رہیں گے۔ خالد علیم دھندلی باتوں کے عادی نہیں..... یہاں دھندلی باتوں سے میری مراد ابہام نہیں کہ وہ جتنا ضروری ہے ان کے ہاں موجود ہے، میں تو اس دھندلے پن کی بات کر رہا ہوں جو دانش میں در آتا ہے۔ وہ دھندلا پن جو تخلیق کار کا وژن واضح نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ان کا حیات و کائنات کا وسیع مطالعہ، ان کے مشاہدات و تجربات، ان کے ہاں پایا جانے والا تجزیاتی اندازِ فکر و دانش انھیں انسان کی تخریب کے ذمہ دار عناصر سے آگاہی دیتا ہے۔ وہ فرد اور معاشرے کے مفید باہمی تعلق کی ضرورتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ جدید عہد کے مسائل سے نبرد آزما انسان ہیں لیکن انھوں نے اپنی تہذیبی و ثقافتی جڑوں سے ناتا قائم رکھا ہے اور ان کے نزدیک کامیابی کا واحد راستہ یہی ہے۔ وہ اپنے فکر و عمل کے توانائی بخش دھاروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ خالد علیم کا اس سے آگے کا سفر کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ اس کے بارے میں ایک اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ:

بر کیا ہے، مجھے جانا کہاں ہے
ابھی میں اپنے پر پھیلا رہا ہوں

☆☆☆☆☆

جناب نوید صادق، جناب جلیل عالی اور جناب خالد علیم

خالد علیم کی نغمۂ محامِد

حضرت علیم ناصری اور ان کے فرزندِ ارجمند جناب خالد علیم دونوں اسلامی ادب کے قابلِ احترام نمائندے ہیں۔ ان دونوں معززینِ ادب کے ذکر سے مجھے اکثر زہیر بن ابی سلمٰی اور ان کے سعادت مند بیٹے حضرت کعب بن زہیر یاد آ جاتے ہیں۔ جس طرح حضرت کعبؓ اپنے والد کے تربیت یافتہ تھے اسی طرح خالد صاحب بھی حضرت علیم کے سایہ پرور ہیں۔ جس طرح زہیر و کعبؓ اپنے ادوار کے اکابرِ ادب میں سے تھے اسی طرح حضرت علیم ناصری اور جناب خالد علیم نے بھی اپنے ہم عصروں سے اپنے کمالِ فن کا لوہا منوایا ہے۔ البتہ ان دونوں جوڑوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ زہیر و کعبؓ کے معاملے میں بیٹا باپ سے یمن و سعادت کے باب میں بہت آگے نکل گیا۔ اس لیے کہ اسے اسلام قبول کرنے اور نعت نگار ہونے کا شرف حاصل ہو گیا اور نعت کے حسنِ قبول کی علامت کے طور پر انھیں بارگاہِ نبویؐ سے چادرِ رحمت بھی عطا ہوئی، جب کہ حضرت علیم اور جناب خالد کا معاملہ یہ ہے کہ بفضل تعالیٰ باپ بیٹا دونوں حمد و نعت کہنے کی سعادت و برکت سے بہرہ مند ہیں اور ادب کی اس صراطِ مستقیم پر حضرت علیم جناب خالد کے خضرِ طریق بھی ہیں۔

زیرِ نظر مجموعۂ حمد و نعت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب خالد علیم نے اس کی تخلیق میں فکری اور فنی محاسن سے بھرپور کام لیا ہے اور میرے ادبی عقیدے کے مطابق حمد و نعت یا دینی ادب کی کوئی اور کاوش اعلیٰ ادبی معیار پر پورا اترنے کے بعد ہی ادب پارہ کہلا سکتی ہے۔ فنی لحاظ سے کمزور تخلیقی کوشش تو خود اپنے موضوع کے لیے بھی نعوذ باللہ تخفیف و استہزا اور انگشت نمائی کا باعث بن جاتی ہے۔ نعت گوئی رسولؐ کائنات سے اظہارِ عقیدت و ارادت کے ساتھ ساتھ انسانوں کو ان کی طرف اور ان کی وساطت سے اسلام کی طرف بلانے کا مبارک عمل ہے۔ نعت کا اچھا شعر سن کر ہم روحانی اور وجدانی طور پر جناب رسالتؐ مآب سے قریب تر ہوتے ہیں اور ہمارے دل اور لب بے ساختہ درود شریف کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں نعت گوئی یا نعت خوانی کو درود خوانی کا مترادف یا متبادل نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک نعت کہنا اور پڑھنا دراصل درود و سلام پڑھنے کے وسائل و محرکات میں شامل ہے۔ اگر کوئی

جعفر بلوچ

نعت اپنے فکری یا فنی نقائص کی وجہ سے درود و سلام پڑھنے اور رسولؐ پاک سے قربت حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ یا حجاب بن جائے تو کیا ایسی نعت کہنے سے خاموش رہنا بہتر نہ ہوگا؟ جناب خالد علیم کے زیرِ نظر کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس تخلیقی نکتے کو بطور خاص ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

زیرِ نظر مجموعۂ حمد و نعت سے پہلے جناب خالد علیم کا مجموعۂ نظم و غزل شائع ہو کر اربابِ ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ حمد و نعت کے میدان میں بھی خالد صاحب تازہ وارد نہیں ہیں، اگر ان کے وسائل ساتھ دیتے تو ان کا یہ مجموعۂ حمد و نعت بھی برسوں پہلے شائع ہو چکا ہوتا۔

جناب خالد کی غیر معمولی قدرتِ کلام ہر ادب پرست قاری کو متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے متعدد اساتذۂ فن کی زمینوں اور متعدد مشہور و معروف قصیدوں یا شعری شاہکاروں کے تسلسل میں دادِ سخن دی ہے اور اپنے نقوشِ کمال کی آب و تاب کو کہیں مدھم نہیں ہونے دیا۔ وہ مشکل اور کم مروج زمینوں اور بحروں میں بھی بڑی کامیابی اور حیرت انگیز سہولت کے ساتھ تخلیقِ فن کی منزلیں قطع کرتے ہیں۔ انھوں نے مردف زمینوں میں بھی متوجہ کرنے والے شعر نکالے ہیں۔ پابند و آزاد فنی ہیئتیں ان کے وجدانی ریموٹ کنٹرول کے اشاروں کی فوری اور بلا تامل اطاعت کرتی ہیں۔ جناب خالد کی حمدیہ و نعتیہ رباعیاں بھی ایک خاص شان رکھتی ہیں۔ رفعتِ فن اور تقدسِ موضوع کے حوالے سے یہ رباعیاں ہمیں رباعیاتِ امجد حیدر آبادی کی یاد دلاتی ہیں۔

ان کی یہ تخلیقات اعلیٰ اور لائقِ حصول تخلیقی معیار کی حامل ہیں۔ میں جناب خالد علیم کے اس جاں پرور مجموعۂ حمد و نعت ''محامد'' کی اشاعت کو دین و ادب کے لیے ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

جناب توقیر عباس، جناب نوید صادق، جناب خالد علیم اور جناب ظہیر کاظمی

خالد علیم .....اہلِ ادب کی مختصر آرا

.....احمد ندیم قاسمی.....

خالد علیم کو جذبہ و احساس کے فن کارانہ اظہار پر استادانہ قدرت حاصل ہے۔ اس قدرت کا بلیغ اظہار اس کی جچی تلی رباعیات سے ہوتا ہے کہ جس صنفِ شاعری پر دورِ رواں کے اہم شاعروں کو بھی قدرت حاصل نہیں ہوسکی، اسے خالد علیم نے بے ساختگی سے برتا ہے۔

اس کی غزل اور نظم جدید تر حسیات کی ترجمان ہیں۔ ان میں وہ عصر بولتا ہے جس میں خالد علیم تخلیقِ فن میں مصروف ہے۔ اس کی غزل خاص طور پر دامنِ دل کو کھینچتی ہے کیوں کہ کلاسیکی غزل کی جملہ مثبت روایات کے احترام کے ساتھ ہی اس کی غزل میں بیسویں صدی کا وہ ربع انعکاس پذیر ہے جس نے جدید غزل کو ایک منفرد تشخص بخشا ہے۔ یہ غزل تغزل سے بھی آراستہ ہے اور شاعر کے گرد و پیش رواں دواں زندگی کے حساس پہلوؤں سے بھی کسبِ جمال کرتی ہے۔

.....

خالد علیم! خوش گو نعت گو

.....خالد احمد.....

نئی نعت احمد ندیم قاسمی اور حفیظ تائب کے اندازِ عقیدت اور پیرایہ ہائے اظہار کا نام ہے۔ خالد علیم ہمارے نوجوان شعرا میں اپنا رنگ، اپنا آہنگ رکھنے والے شعرا میں سے ہیں، اور نعت ان کا محبوب پیرایۂ اظہار ہے--- حضور نبیؐ کریم کے بارے میں لب کشائی یوں بھی مشکل تر قرار پاتی ہے کہ لب کشا کے ہونٹ تو ان کے پاک ذکر ہی سے گلال ہو جاتے ہیں، اور یہ گلال کاغذ پر ذاکر کے بے اختیار بوسوں کی بے اختیاری کا تصور تو پیدا کر سکتے ہیں، بے اختیاری کا نشان نہیں بن پاتے---

''محامد'' خالد علیم کی بے اختیاری کا فسانہ ہے۔ اس کا ایک ایک شعر تلا ہوا، جچا ہوا اور پرکھا ہوا ہے۔ ادب کا تقاضا ہے کہ یہ بوسے بڑی عقیدت--- اور--- احتیاط سے لیے جائیں کہ سادہ کاغذ پیش دربارِ رسالتؐ ہونا ہے اور وہ ان نشانات کے پیچھے تپاں جذبات کو سمجھنے اور سراہنے والے ہیں--- ہم جیسے لوگوں کے لیے محامد میں در آنے والے چند الفاظ اجنبی ہوں تو ہوں مگر ان کے دربار میں کوئی لفظ غریب نہیں کہ وہ دیارِ علم ہیں اور خالد علیم کی لفظالی (Vocabulary) ان تک، اس کے جذبات کی ترسیل کا سادہ ترین ذریعہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ عشق نبیؐ کریم کے طفیل خالد علیم کے ''محامد'' کا اجرا اپنی عنایات کے

خصوصی خزانوں سے عطا فرمائے اور ہم سب کو ان انعامات کا گواہ ٹھہرائے، دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ آمین، ثم آمین!

.....

خالد علیم کی نعت

.....خورشید رضوی.....

خالد علیم کی نعت میں جذبے، علم اور ریاضتِ فنی کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جو عجلت کے اس دور میں بہت کم یاب ہے۔ یہ ریاضتِ فنی ان کے ہاں حسب کے علاوہ نسب کا درجہ بھی رکھتی ہے کہ جس گھر سے ''شاہنامہ بالاکوٹ'' اور ''طلع البدر علینا'' کا طلوع ہوا ہو، اتنی ریاضت تو اس کی فضا میں رچی ہوئی ہوتی ہے۔

''محامد'' میں گو بیش تر انحصار قصیدہ و غزل ہی کی ہیئت پر رہا ہے تاہم مسدس، آزاد نظم اور رباعی کی مشکل صنف کو بھی کامیابی سے برتا گیا ہے۔ خالد علیم کے ہاں مضامینِ نعت ذاتی عقیدت کی وارفتگی سے لے کر آفاقی امکانات کی دستک تک، اپنی گوناگوں وسعتوں کے امین ہیں۔ نعت ان کے نزدیک کیفِ شرابِ طہور سے لے کر دولتِ فہم و شعور اور سلطنتِ بے ثغور تک سب کچھ ہے۔ وہ اللہ سے قدسی و بوصیری و جامی، سعدی و نظیری و نظامی اور اقبال و گرامی کا جذبہ، فکر اور لہجہ مانگ کر آگے بڑھے ہیں۔ امید ہے کہ اس نورانی تسلسل میں جادۂ

جناب اشرف سلیم، جناب خالد علیم کو ''کلیاتِ نعت'' پیش کرتے ہوئے۔

نعت پر ''محامد'' کا یہ چراغ، آنے والوں کے لیے دلیلِ راہ ثابت ہوگا اور اس کی لو سے اور چراغ روشن ہوں گے۔

.....

.....خواجہ محمد زکریا.....

ان دنوں جب کہ شعری مجموعوں کی اشاعت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، نئے شعرا کو عموماً اپنی آواز اہلِ ادب تک پہنچانے کے لیے ایسی جدّت کا سہارا لینا پڑتا ہے جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے، مگر خالد علیم کے اس اوّلیں شعری مجموعے میں جدّت کی اونچی لہر فنی ہنرمندی کی متوازی لہر کو ہمراہ لیے بڑی کام یابی سے ساحلِ مراد کی جانب رواں دواں ہے۔۔ انھوں نے موجودہ دور کی نظریاتی شکست و ریخت کی تفہیم اور تجسیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو ''کھوجنے'' کا کام بڑی عمدگی اور فنی ہنرمندی سے انجام دیا ہے۔ یقین ہے کہ فکری بالیدگی، بحور و اصناف کے تنوع اور ہمواریِ اسلوب کی وجہ سے یہ مجموعہ لطیف الطبع اور سلیم الفطرت قارئین کو متوجہ کرنے میں کام یاب رہے گا۔

.....

سلیم کوثر......

خالد علیم محبتوں سے لب ریز خوشبو اُڑاتا ہوا ایک دھنک رنگ شاعر ہے- اداسیوں کے سے خوشبیوں کی مہک بانٹنے والا ایک دل دار آدمی ہے- اس دورِ حرص و ہوس میں خود کو محسوس کرواتا ہوا ایک نیک نامی کا خوب صورت لمحہ آتے جاتے موسموں کی تمثیل میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے- اس کے خوابوں کا اظہار اتنا واضح اور امید کا ایسا آئینہ ہے جس میں نئی دنیا کے عکس جھل مل کرتے ہیں- خالد علیم جیسے محنت، مسلسل محنت پر یقین رکھنے والے شاعروں میں شاعر و ادیب ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے-

خالد علیم انتہائی بشاش شاعر اور باشعور ادیب اور بہت سرگرم تجزیہ کار ہے جو عین حقائق ہی سے آگاہی نہیں رکھتا، زندہ رہنے کا حوصلہ بھی فراہم کرتا ہے- سب سے بڑھ کر وہ ایک سچا پاکستانی ہے- ایک ایسا شاعر جو زندگی کے منظر نامے پر اپنی محنت، لگن اور فکر و دانش کی آمیزش سے پیدا ہونے والی انفرادیت کے والہانہ اظہار کی تخلیقی رواداری کے ساتھ زندہ ہے-

....

باقی احمد پوری......

1970 کی دہائی میں جن شعراء نے ادب میں اہم کام کیے اور اپنا نیک نام کمایا ان میں خالد علیم سرفہرست ہیں- خالد علیم علامہ علیم ناصری کے فرزند ارجمند ہیں- اس عہد میں اب ایسے شاعر خال خال نظر آتے ہیں جنھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہو- خالد علیم ہمہ جہت قسم کے شاعر ہیں- انھوں نے رباعی، مرثیہ، قصیدہ، نظم، غزل، مسدس غرضیکہ ہر صنفِ شاعری میں اعلیٰ شاعری کی ہے- لاہور میں جو چند اساتذہ سخن ہیں، ان میں خالد علیم زیادہ مستند ہیں- بے شمار شعرائے کرام ان سے کسبِ فیض کرتے ہیں- کچھ اعلانیہ اور بہت سے غیر علانیہ- اگر کبھی پاکستانی ادب پر کسی نے بغیر کسی مصلحت کوشی کے تحقیق کی تو خالد علیم ایک بہت قد آور شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے گا- وہ شہرت کے لیے تگ و دو نہیں کرتا- میری طرح گوشہ نشینی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے کام میں مگن ہے- علم و ادب ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے-

....

سیف اللہ خالد......

خالد علیم کا کمال یہ ہے کہ---- اس کے فن پاروں میں عروضی پیمانوں کی گردش سماں باندھ دیتی ہے- یہ سماں اس وقت اور نکھر آتا ہے جب کوئی سخن ور رباعی کے میدان میں قدم رکھتا ہے- رباعی فی الواقع دشت کے نخلستان جیسا خطۂ پُربہار ہے- یہیں سچے سخن ور کے جوہر کھلتے ہیں اور غیر متوازن شاعر کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے- بات یہ ہے کہ رباعی کے چوبیس اوزان مخصوص ہیں- ان کا اجتماع تو جائز ہے مگر

ان کی حدود سے تجاوز کرنا امرِ محال ہے۔
چناں چہ یہاں غالب جیسے اساتذہ تک لغزش کھا جاتے ہیں:

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
(غالب کا یہ مصرعہ رباعی کے تمام اوزان سے خارج ہے)

خالد رباعی گو قبیلے کا (شاید) آخری فردِ وحید ہے جس طرح وہ نظم و غزل میں عروضی و لسانی حزم و احتیاط ملحوظ رکھتا ہے، رباعی میں بھی عالمانہ سلیقے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی کاوشوں کے مطالعے سے کھلتا ہے کہ اس نے جاں کاہی سے کلاسیکی ذخیرے کو کھنگالا اور اپنے دل و دماغ کا حصہ بنایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے پیش روؤں کے نظامِ فکر سے انحراف بھی کیا ہے۔ اس تناظر میں جوش اور خالد علیم کا شعری وژن اکثر مختلف و متضاد دکھائی دیتا ہے۔ جوش کہتے ہیں:

ظلمت ہر روشنی کو کھا جاتی ہے
ہر صبح کے منہ کو شام سنولاتی ہے

پڑتی ہے کسی شہر کی جس وقت بِنا
بے ساختہ کھنڈروں کو ہنسی آتی ہے

.....

لیکن خالد علیم ایسا رجائیت پسند شاعر ہے جو تعمیر و ترقی کا قائل ہے کہ یہی حاصلِ حیات ہے:

اے ہم نفسانِ گلستاں! رکھ دی ہے
جلتے صحرا میں خشتِ جاں رکھ دی ہے

کارِ تعمیر تم کرو یا نہ کرو
ہم نے تو بنیادِ مکاں رکھ دی ہے

.....

دراصل خالد علیم کی شاعری کی اساسی قدر تہذیبِ احساس ہے۔ اس خوبی نے اسے سنجیدہ فکر شاعروں کی صف میں کھڑا کیا ہے۔ آج کل جس قسم کی شاعری کا رجحان ہے اور مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کا پیہم عمل جاری ہے، خالد علیم کی آواز الگ پہچانی جاتی ہے--- خالد علیم تمام کامیاب سخن وروں کے ہم قدم ہے۔ وہ باشعور انسانوں کی طرح قدیم و جدید کے سنگم پر استادہ عالمِ حیرانی میں حیات و کائنات اور اس کی ممکنات کے متعلق تازہ تر سوالات اٹھا رہا ہے۔ اس کی ریاضتوں سے شعری جمالیات کا ایک انوکھا سکول سامنے آیا ہے۔

.....

.....ضیا الحسن.....

خالد علیم ایک پختہ گو شاعر ہیں۔ انھیں شعری کمالات پر دست رس حاصل ہے۔ اس مجموعہ کی یہی خوبی نہیں کہ یہ اپنے وقت کی آواز ہے بلکہ اس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ انھوں نے ایک اچھے شاعر کی طرح اپنی بات اس تخلیقی رچاؤ کے ساتھ کی ہے جو شاعری کو کسی خاص موضوع اور کسی خاص دور کے ساتھ محدود نہیں کرتا بلکہ اس کی

مستقل شعری حیثیت قائم کرتا ہے۔

.....

.....خالد قیوم تنولی.....

خالد علیم کی ''وَالضُّحٰی اِذَا تَنَفَّس'' اوپر تلے کے سانحات اور سقوطوں کی طویل رزمیہ داستان اپنے دامن میں سمیٹے تحیر، تجسس اور تلطف کے احساسات کے ساتھ جو بڑھی تو پھر بڑھتی ہی چلی گئی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی خواب پسندی اور نیم بیداری کو اس کے ماضی، حال اور آیندہ کے آئینے میں دیکھنے کی یہ سعی کمال درمندی کی عکاس ہے۔ میں تو زبان و بیان، علامات، استعاراتی دروبست اور کثیر المعنویت کی حامل ان سطور کو پڑھتا گیا اور متنوع جذبات و احساسات سے ہم کنار ہوتا گیا۔ اس نظم پر درحقیقت ایک طویل، مثبت اور بامعنی مباحثہ ہونا چاہیے جس میں فکر کی زرخیزی اور فن کی تاثیر اپنے کامل عروج پر ہے۔

.....

.....اشرف سلیم.....

ہماری نسل میں بہت کم ایسے احباب ہیں جنھوں نے فارسی اور اردو ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہو۔ لفظ کی روح کو سمجھا ہو اور الفاظ کو مختلف جہتوں میں دیکھا اور برتا ہو۔ خالد علیم کا شمار انھی چند لوگوں میں ہے جنھوں نے کلاسیکی اور جدید ادب کو بہت گہری نظر سے دیکھا ہے۔ ان کی شاعری، غزل و نظم دونوں میں اس کی گواہی ملتی ہے۔ خالد علیم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے شاعری کی (تقریباً) ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور پر رباعی، مثنوی، مرثیہ وغیرہ ان کے تخلیقی رجحانات کے مختلف فنی و فکری زاویے ہیں۔ ان کی غزل ہو یا نظم، ایسی روانی ملتی ہے کہ قاری سانس روکے بغیر ان کی معنوی پرتوں کو کھولتا چلا جاتا ہے۔۔۔ خالد علیم کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے جو تشبیہات، استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں ان میں نیا پن اور نئے معنی ہی نہیں ملتے بلکہ ہماری عصری صورتِ حال کی مکمل تصویر، جیتی جاگتی تاریخ اور اشعار میں چلتے پھرتے کردار بھی ملتے ہیں۔

.....

.....رحمان حفیظ.....

برادر مکرم خالد علیم سے زیادہ ملاقات نہیں رہی مگر میں انھیں لگ بھگ چھبیس ستائیس سال سے جانتا ہوں۔ جب میرا کلام ''سیارہ'' میں چھپنا شروع ہوا تھا، مجھے ہمیشہ ان کی غزل اچھی لگی۔ بعد ازیں ان کی مزاحمتی شاعری، نعتیں، نظمیں اور دیگر اصناف دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم انھیں جتنا جانتے ہیں، وہ اپنے والدِ محترم کی طرح اس سے بھی کہیں آگے کے شاعر ہیں۔ بہرحال مجھے ان کی غزل سے خاص تعلق

جناب رشید نثار، جناب تبسم رضوان، جناب یزدانی جالندھری، جناب سلطان صبروانی
جناب حامد یزدانی، جناب خالد یزدانی، جناب رازکاشمیری، جناب یونس حسرت، جناب انور ملک، جناب زبیر کجگاوی، جناب خالد علیم، جناب سرور انبالوی

ہے۔ آج بھی ان کی غزل مجھے تین عشرے پہلے کی طرح ہانٹ کرتی ہے۔ ان کی زبان پر اس خاک سار کا نام آنا ہی میرے لیے فخر وانبساط کا باعث ہے۔

.....

.....محمد عاصم بٹ.....

خالد علیم کی ادبی پہچان کا مضبوط حوالہ شاعری ہی ہے، خاص کر نعتیہ شاعری جس میں آپ نے اپنی طرز پیدا کی۔ فکشن کے میدان میں آپ کی آمد خوش آیند ہے۔ پہلے کہانیوں کا مجموعہ (مردہ آنکھ میں زندہ چہرہ) اور اب پیشِ نظر ناول۔ آپ کی پیش رفت جارحانہ مگر امید افزا ہے۔ دل چسپی کسی بھی ادب پارے کی حمد گی اور پختگی کا اولین معیار ہے۔ اس کسوٹی پر تو یہ ناول سونے کے تول کی طرح پورا اترتا ہے۔ زبان و بیان پر گرفت، بیانیہ کی روانی اور کہانی کا تال میل خالد علیم کی فکشن کے ساتھ کمٹمنٹ، ان کی متانت اور محنت کا آئینہ دار ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ لمبی اُڑان کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ناول سوانحی فضا کا حامل ہے اور مختصر ہونے کے باوجود ایک لہر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب اقبال احمد قمر، جناب خالد علیم

جناب خالد علیم، جناب ناصر زیدی

خالد علیم..... ''کلیات نُما''

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب اپنی ادبی وراثت اگلی نسلوں تک منتقل کرے اور اس طرح سے کرے کہ بیٹا، باپ کو بھی پیچھے چھوڑ دے۔ جناب خالد علیم کے والدِ محترم علیم ناصری حمد و نعت اور شاعری کے حوالے سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا علمی خزانہ خالد علیم تک منتقل ہوا اور انھوں نے بھی گزشتہ چار پانچ دہائیوں میں بہت سے ادبی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ افسانہ، ناول اور تحقیق و تنقید کے علاوہ شاعری ان کی خاص پہچان ہے اور اس تناظر میں وہ اپنے کئی ہم عصروں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان کی اب تک کی شاعری پر مشتمل ''کلیات نما'' ہے جس میں اُن کی طبع شدہ کتب کے علاوہ بہت سارا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ اس کلیات میں شاعری کی تقریباً سبھی اصناف شامل ہیں جن میں حمد و نعت سلام، مرثیہ، شہر آشوب، رباعیات، نظم اور غزل اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں اور اپنے اندر دعوتِ مطالعہ دینے کی پوری طاقت رکھتی ہیں۔ کوئی بھی صنفِ سخن اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو کہیں کوئی کمزور شعر نظر نہیں آئے گا۔ بھرتی کا کوئی مصرع اپنا چہرہ نہیں دکھائے گا۔ حمد، نعت، سلام غزل کوئی بھی چیز شروع کر لیں آپ اُس میں مستغرق ہو جائیں گے کیونکہ یہ ساری شاعری سخت ریاضت اور کڑی مشقت کے بعد وجود میں آئی ہے اس لیے سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے۔

''کلیات نما'' کی ترتیب بہت شاندار ہے۔ کتابوں کو مرحلہ وار اشاعت کے حوالے سے ترتیب دینے کے بجائے تقدیم و تاخیر اور ادب و آداب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترتیب سے سجایا گیا اور آغاز حمد، نعت سے ہو رہا ہے۔ اُس کے بعد بالترتیب تمام اصناف جلوہ گر ہوری ہیں۔ سو سب سے پہلے حمد کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

گناہ گار ہوں اے میرے مہربان خدا
اگر گناہ نہ ہوں، چشمِ نم کہاں سے آئے
تری رضا سے علاوہ تری عطا کے بغیر
بدن میں طاقتِ رفتار و رم کہاں سے آئے

.....

خالد علیم کی نعت مروجہ نعتؐ سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں روایتی مضمون کے بجائے منفرد خیالات سے کام لیا گیا ہے جس سے ان میں بہت زیادہ جدت بھی پیدا ہوئی

آفتاب خان

ہے اور کلاسیکی انگ بھی اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ نعت نما ایک مسلسل نعت کی صورت میں ہے جو تخلیقِ آدم سے لے کر فتح مکہ تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ غرفۂ اول ہے جبکہ غرفۂ دوم مقدِ نعت :عصری تناظر کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

اسی باب کے اگلے حصہ میں اُن کا نعتیہ مجموعہ "محامد" موجود ہے جس میں ایک طویل قصیدۂ نعتؐ کے ساتھ ساتھ تقریباً 28 نعتیں شامل ہیں۔ اُس کے بعد پھر ایک طویل نعت اور بعد ازاں کچھ مناقب بھی دل وروح کو معطر کر رہے ہیں۔ خالد علیم کی نعتؐ میں وارفتگی، حزن، التجا، دعا، اشک و ندامت عقیدت، حبِ رسولؐ، مقدمہ اور شکایت کے عناصر کی موجودگی اُن کی نعت کو یکسر مختلف انداز عطا کرتے ہیں اور اِن نعتوں کی قرأت کرتے ہوئے قاری پر رقت طاری ہونے کے ساتھ ساتھ حبِ رسولؐ کی تڑپ بھی سوزِ دل بن کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اُس پر نعتؐ میں موجود لفظیات، تشبیہات اور استعار تازہ کاری کی نئی راہ کھاتے ہیں۔ الفاظ کے دروبست، نشست و برخاست میں اتنی روانی ہے کہ قاری اس، بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اُن کی نعتوںؐ سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

سلیقہ مجھ کو آ جائے اگر نعت محمدؐ کا
مرے ہر شعر میں موجود ہو مضمون آمد کا

آنکھوں سے چشمۂ دلِ بے تاب اُبل پڑا
تسنیم و سلسبیل کا طرزِ خرام ہے
اے مونسِ افسردگاں، چارہ گرِ آزردگاں
اے دولتِ اندوہگیں یا رحمت العالمیں
گل و سخن میں نہ مشک ختن میں وہ تاثیر
جو سرزمینِ مدینہ کی خاک راہ میں ہے

.....

کتاب کا اگلا باب "بغداد آشوب" کے عنوان سے ہے جس میں بغداد اور دیگر اسلامی ممالک پر غیر مسلموں کے ہونے والے ظلم وستم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسلام اور اہلِ اسلام سے خالد علیم کی محبت اور اُن پر ہونے والے ظلم کی تڑپ اس باب کی نظموں میں نہایت شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان میں کہیں نعرے بازی نہیں بلکہ تعلیمیت اور شعریت کے ذریعے مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو بیدار کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ ان میں شامل نظمیں چند آنسو، امن اور جنگ، عراق نامہ، خطا معاف، سرزمینِ عراق، علی اسمٰعیل، بغداد جل گیا، اک اور دجلہ خوں وغیرہ مسلم ممالک، عراق، شام، لبنان، فلسطین وغیرہ میں ہونے والی بمباریوں اور نہتے مسلمانوں کی چیخ پکار کا نوحہ بیان کرتی ہیں۔ ان میں کچھ طویل نظمیں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ لبنان آشوب کا ایک باب بھی اسی باب کا ذیلی حصہ ہے۔ اُس کے بعد عالمی تناظر میں کچھ اور نظمیں بھی

کتاب کا حصہ ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ کر کے یوں محسوس ہوتا ہے کہ خالد علیم، حضرت علامہ اقبال کے فکر و خیالات کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ اُمت مُسلمہ کی جو تڑپ ڈاکٹر اقبال میں موجود تھی وہی تڑپ، وہی جذبہ نظر آتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے مسلسل زوال کی طرف جھکاؤ خالد علیم کے بھی پیشِ نظر ہے۔ اسی لیے یہ بہت سارا کلام آشوب کی صورت میں قلم اور آنکھوں سے بہہ نکلا ہے اور اُمتِ اسلام کی زبوں حالی کی داستان بیان کر رہا ہے۔

''بغداد آشوب'' کے اس باب میں متفرق نظموں کے علاوہ کچھ دیگر ہنر مندی بھی دکھائی گئی ہے جن میں تضمین بر شعرِ غالب، مولانا حالی کے ایک شعر پر تضمین۔ علامہ اقبال کی ایک نظم ''دعا'' کے ایک اختتامی شعر کے ساتھ، نذرِ اقبال (تضمین) نذر باقی احمد پوری، حامد یزدانی کے لیے ایک نظم، حکیم محمد سعید کی شہادت پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں یادِ رفتگاں میں حفیظ تائب، علیم ناصری، جعفر بلوچ، عبدالعزیز خالد، ہاجرہ مسرور کی یاد میں، خالد احمد کی یاد میں، اعجاز گل کے لیے اور اعجاز گل کی یاد میں کہی گئی عقیدت مندانہ نظمیں مطالعہ کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس باب کے آخر میں شعری مجموعہ، شام، شفق، تنہائی کی منتخب نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر خالد علیم کی نظم بھی اُتنی ہی مضبوط ہے جتنی ان کی حمد و نعت یا غزل پختگی رکھتی ہے۔

رباعیات کہنا بھی شعر و سخن کا ایک اہم رکن ہے۔ فی زمانہ رباعی کہنے کی رسم بہت کم ہوتی جارہی ہے اور معدودے چند بشیر رزمی، آصف عاقب، مامون ایمن، آفتاب مضطر اور خالد علیم وغیرہ شامل ہیں۔ بھارت میں بھی کچھ بزرگ شعرا اس صنف میں اظہارِ شعر کر رہے ہیں مگر مجموعی طور پر اس صنف کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کے اوزان مروجہ اوزان و بحور سے قدرے مختلف ہیں لیکن مشکل ہرگز نہیں۔ بہرحال خالد علیم بھی اُن شعرائے عظیم میں شامل ہیں جنھوں نے رباعی کی صنف کو گلے سے لگا رکھا ہے لہٰذا ان کے اس ''کلیات نما'' میں تمثال کے عنوان سے ایک باب رباعیات کا بھی ہے جس میں 1980ء سے لے کر تا حال کہی گئی رباعیات شامل ہیں۔ ان میں کچھ رباعیات بابا طاہر ہمدانی کی دو بیتیوں کے تراجم اور چند رباعیات عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ بھی شامل ہیں۔ خالد علیم نے رباعی کو بھی اعتبار بخشا ہے اور اسے مختلف موضوعات میں ڈھال کر تشکیل دیا ہے۔ ان رباعیات میں داخلی اور خارجی ہر دو طرح کے مضامین اپنا جلوہ دکھاتے ہیں اور ذہن و دل کو کشادگی سے ہم کنار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی دو رباعیاں ملاحظہ کریں۔

میرے چہرے پہ انتساب اُس کا ہے
ہے خواب مرا تو عکسِ خواب اُس کا ہے

جو کچھ بھی مجھے دیا، دیا ہے اُس نے
یہ درد، یہ غم، یہ اضطراب اُس کا ہے

.....

اس دشت میں بوئے گل، نہ گل پیرہنی
یہ ہجر کے صبح و شام اللہ غنی
خالد ہم ان دنوں اسیر اُس کے ہیں
کہتے تھے جسے لوگ غریب الوطنی

.....

واقعۂ کربلا تاریخِ عالم کا وہ زندہ منظر نامہ ہے جو تا قیامت نوعِ انسانی کے دل کو سوز و گداز اور عزم و حوصلہ عطا کرتا رہے گا۔ اس واقعہ کو مختلف شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے رقم کیا ہے اور شاعری کی مختلف اصناف، سلام، نوحہ، مرثیہ میں مختلف زاویوں سے بیان کیا ہے۔ خالد علیم بھی سلام کے ساتھ ساتھ ایک مرثیہ کے خالق ہیں۔ بصیرت کے عنوان سے اس باب میں یہ ایک طویل مرثیہ شامل ہے جو 2010 میں کہا گیا۔ یہ مرثیہ بھی خالد علیم کی دیگر اصنافِ شاعری کی طرح منفرد انداز کا حامل ہے۔ انھوں نے اس میں صرف واقعہ کربلا ہی کو موضوع نہیں بنایا بلکہ اس کے محرکات بتانے کی کوشش بھی کی ہے۔ قاتلانِ حسین کی بے حسی اور رقیق القلبی کا نوحہ بھی کہا ہے اور اسلام کے نام لیواؤں کی ہٹ دھرمیوں کا پردہ چاک کرنے کے علاوہ عالم اِسلام کو اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے پر شرم دلانے کی سعی کی گئی ہے۔ مرثیہ کے دو بند حاضرِ خدمت ہیں اس سے اس مرثیہ کے تیور کا اندازہ ہو جائے گا:

پوچھ اُس سے یہ کہ خُلد کا مقسوم کون ہے
ظالم ہے کس کا نام تو مظلوم کون ہے
حق کی زباں میں صفحۂ مرقوم کون ہے
موجود کون کون ہے، معدوم کون ہے
کبر و انا میں، ظلم پرستی میں کون ہے
ہے کون سرفراز تو پستی میں کون ہے
دیکھا ذرا نہ اُس نے کہ یہ کس مقام پر
کس کو کیا شہید سیاست کے نام پر
ظلم اِس طرح اُٹھایا سپاہِ امام پر
اب تک لہو جما ہے گزر گاہِ شام پر
دیکھا نہ اُس نے نام و نسب دیکھنے کے بعد
دشمن نے بھی کیا ہے ادب دیکھنے کے بعد

.....

اب ہم اس ''کلیات نما'' کے آخری حصے کی طرف گامزن ہیں جو صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں تین شعری مجموعے سفینہ کنارے پر، شب و روز، شامِ شفق تنہائی کی تمام غزلیات یکجا کر دی گئی ہیں۔ ان غزلیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے اور تمام گرہوں سے آزاد ہو کر یہ بتاتی ہے کہ خالد علیم کی غزل، غزل کے تمام تر لوازمات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ وہ ایک اُستاد شاعر ہیں۔ اس لیے اُن کے کلام میں کسی قسم کا کوئی فنی نقص دکھائی نہیں دیتا۔ ایطائے جلی، ایطائے خفی، شتر گربہ، عیب تنافر، تکرارِ ردیف، حشو و زوائد اور اسی نوع

کے دیگر نقائص سے اُن کی شاعری یکسر پاک ہے اور ابتدا سے آخر تک ان کی تمام غزلیات میں بے حد پختگی اور مشاقی کارفر ہے۔ صرف چند شعر دیکھیے:

یہ نو بہ نو کا تماشا ہے کیا ادا سے زیادہ
دکھائی دیتا ہے اُس کا بدن قبا سے زیادہ
بلا کے حبس میں محبوس کر دیا گیا ہم کو
مکالمہ کبھی ہوتا نہیں ہوا سے زیادہ
یوں چشم نم ہے رنگِ غزل سے بھری ہوئی
جیسے ہو جل پری کوئی جل سے بھری ہوئی
حضور شاہ چلیں گے، صدا کریں گے ہم
جو کوئی زخم سے چیخ اُٹھا کیا کریں گے ہم
لٹے پٹے ہوئے اُن راستوں سے آتے ہوئے
یہ سب زمین تھی آفت رسیدہ ہم ہی نہ تھے

.....

آخر الذکر شعر ہجرت کے کربناک واقعات کی کیا خوب عکاسی کر رہا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت لاکھوں لوگوں کی ہجرت نے ادب کا دامن بہت مالا مال کیا۔ اُس حوالے سے کی گئی شاعری اور افسانے اب کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حساس انسان اور دردمند شاعر ہونے کے ناطے خالد علیم زمین اور زمین سے جڑے کرب و آلام سے ہرگز بے خبر نہیں اس لیے اُن کی شاعری میں ہر موضوع اور ہر خیال اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ داخلی اور خارجی دونوں طرز کے اشعار ان کی غزل کا حصہ ہیں۔ وہ جدت طرازی اور نو بہ نو کو شاعری کی اساس سمجھتے ہیں اس لیے روایتی اور غیر روایتی موضوعات کو اپنے الفاظ کے رنگا رنگ ذخیرے سے منفرد بنانے کا کمال جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اور اشعار دیکھیے:

انتہا کیا غزل کی پوچھتے ہو
اس نے جو میر سے نہایت کی
اگر یہ عشق ہے، اس کا اعادہ ٹھیک نہیں
یہ کم تو ٹھیک ہے لیکن زیادہ ٹھیک نہیں
خود اپنے زخم تمنا کا رنگ دیکھتا ہوں
لگا کے مصرعۂ ثانی پہ حسب حال گرہ
کہیں بازار کی رونق ہی نہ کم پڑ جائے
چاہ کم آب تک آنے دو مرے بھائیوں کو
یوسفِ دل کی ہے کیا قدر، کہاں جانتے ہیں
بس تماشے سے تعلق ہے تماشائیوں کو

.....

آخری دو اشعار میں تلمیحات کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے، یہ فن بہت محنت اور سخت ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ خالد علیم چوں کہ ابتدا ہی سے ایک پختہ گو شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں اس لیے غزل کی باریکیوں، اداؤں، علامات اور استعاروں سے بخوبی واقف ہیں اور اپنی ہنرمندی سے کچھ نہ کچھ نیا کمال کر دکھاتے ہیں۔ ان کی غزل کے ہر شعر میں ندرت، تنوع اور نیا پن صاف محسوس ہوتا ہے۔ کہیں کسی سُقم کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور ہر شعر کی روانی میں اوزان کے ساتھ ساتھ

لفظوں کا چناؤ اور ان کا برمحل استعمال خالص ہنرمندی ہے اور یہ گرفت اُستاد شعرا کے ہاں ہی ملتی ہے اُن میں خالد علیم صفِ اول میں شامل ہیں۔ ان کے چند مزید اشعار سے حظ اٹھایئے۔

بارش بھی زمینوں کی نہیں پیاس بجھاتی
شاید کہ ہوئی ہم سے خطا اور طرح کی
یہ تو نہیں کہ بس مجھے وحشت زیادہ ہے
اس شہر کے مزاج میں شدت زیادہ ہے
حصار میں کہیں لے لے نہ پھر دل و جاں کو
تمھاری یاد کی خوشبو بڑی رسیلی ہے
سحر فروشوں نے ایسی سحر فروشی کی
کہ ہر صدا پہ ہے قدغن بریدہ گوشی کی
انھیں تو کد ہے مرے شہر کے اُجالوں سے
کرو نہ کوئی شکایت چراغ والوں سے

.....

غزل کے مندرجہ بالا تمام اشعار ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سفینہ کنارے پر'' سے لیے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی آخری غزل فارسی زبان کی ہے۔ اس طرح انھوں نے اردو کے ہم رکاب فارسی کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ یہ بات تو صاف عیاں ہے کہ خالد علیم کے اس کلیات نما میں جس قدر بھی شاعری شامل ہے وہ ہے تو اردو زبان میں لیکن اُس میں عربی اور فارسی الفاظ کا بھی بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے اور ایسی لفظیات استعمال میں لائی گئی ہے جو اُردو میں شاذ شاذ ہی نظر آتی ہے۔ خصوصاً اُن کی نعت میں عربی اور فارسی کا خاصا رنگ نظر آتا ہے۔

خالد علیم کی غزل کئی حوالوں سے انفرادیت کی حامل ہے۔ کلاسیکی روایت کا دامن تھام کر انھوں نے جدید تر اندازِ سخن کیا ہے جو قاری کی ذہنی بالیدگی کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ عہدِ حاضر میں یقیناً خالد علیم اپنے ہم عصروں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ پانچ دہائیوں میں شعر و سخن کو اپنے خون سے سینچا ہے جو اُن کی شاعری سے لگن اور عقیدت کا عکاس ہے۔ غزل کو انھوں نے اپنے شب و روز عطا کر کے اس کی رفعت میں اضافہ کیا ہے اور جو رنگا رنگی اُن غزل میں موجود ہے وہ اہلِ ذوق کو یقیناً متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آخر میں اُن کے مزید شعر دیکھیں۔

شہر میں جب غنچہ دہی، گل پیرنی مقبول ہوئی
زہرہ جبینوں، ماہ وشوں کو بے مہری معمول ہوئی
سخن زیادہ ہے لیکن سخن وری کم ہے
تو اصل یہ ہے کہ سینوں میں روشنی کم ہے
میں اسیرِ شامِ قفس رہا مگر اے ہوائے دیار دل
سرِ طاقِ مطلعِ آفتاب مری نگاہ دھری رہی
وقت کے آتش دان میں تو نے میرے عکس جلا ڈالے
میں نے بھی اپنے دیوان سے اکثر شعر نکال دیے
اُس کے تغافل سے کیا شکوہ، جس نے میرے شعروں کو
پھول کی خوشبو، چاند کی ٹھنڈک لفظوں کے سُر تال دیے

☆☆☆☆☆

غزل

مٹی ہو کر جھلس رہا ہے
یہ جسم عجیب تجربہ ہے

میں اپنے آپ میں نہیں ہوں
مجھ میں کوئی دوسرا کھڑا ہے

دو میں ہے ذرا ٹھنی ہوئی سی
بیٹھا ہوا کوئی تیسرا ہے

کیوں سوئیے گھر میں چین کی نیند
احساس ، تمام رَت جگا ہے

کیا رویئے رونا بے حسی کا
بے حس، بے اختیار سا ہے

''دیوانہ بہ کارِ خویش ہشیار''
سورج سے چراغ مانگتا ہے

بے آس نراس جائیں گے ہم
قارون کا بھید کھل چکا ہے

سر تک ہی رہے یہ دل کا ایوان
بنیاد میں رخنہ پڑ گیا ہے

کل صبح ، مَیں آئنے میں دیکھا
اک عکس چرا لیا گیا ہے

کل رات میں بے بسی میں سمجھا
کٹیا میں چراغ جل رہا ہے

لوٹ آیا ہے کل کے زخم لے کر
یہ شام کا ملگجا بھی کیا ہے

خالد علیم

غزل

نہ اپنے حال، نہ اپنی خبر میں ہم تم تھے
وہ کوئی اور نہیں تھا، سفر میں ہم تم تھے

سحر سے شام ہوئی، رہ گزر تمام ہوئی
نہ راستے میں کہیں تھے، نہ گھر میں ہم تم تھے

یہ اور بات کہ دونوں کا ایک راستہ تھا
یہ اور بات کہ سودائے سَر میں ہم تم تھے

یہ بات ہے کہ کوئی بات ہی نہ کی ہم نے
یہ بات ہے کہ کسی شور و شر میں ہم تم تھے

کئی دنوں سے کوئی رنج کھینچتے رہے ہم
کئی دنوں سے پرانے اثر میں ہم تم تھے

چلے قدم بہ قدم اور اُڑے تو شاخ بہ شاخ
بکھر کے سلسلۂ بال و پر میں ہم تم تھے

صبا کے حال پہ ہم تھے خزاں کے آوارہ
ہوا کی تال پہ برگِ شجر میں ہم تم تھے

شکستہ ہوتا گیا آئنہ جو ایک ہوئے
الگ کھڑے تھے تو عکسِ دِگر میں ہم تم تھے

ہم ایک رُخ پہ صدا تھے، تم ایک رُخ پہ قبا
کواڑ بند تھے، اِمکانِ در میں ہم تم تھے

کہے یہ کس طرح خالدؔ کہ وہ زمانہ گیا
سراب تھا کوئی جس کی نظر میں ہم تم تھے

خالد علیم

غزلیں

رُک گیا وہ لرزشِ دَر کی طرح دَر میں اکیلا
ایک سایہ چل پڑا میرے برابر میں اکیلا
دوسرے کو دوسرے دل کی خبر کوئی نہیں ہے
ہر کوئی شوریدہ سر ہے اپنے اندر میں اکیلا
ایک انبوہِ غم دُنیا مرے دل میں بسا ہے
ایک دُنیا کا سفر کرتا ہوں میں گھر میں اکیلا
یہ تمناؤں کی بنتی ٹوٹتی صورت بھی کیا ہے
کوئی تنہائی میں دنیا، کوئی اکثر میں اکیلا
یوں مکاں ہے روزنوں تک پھیلتی ویرانیوں میں
آدمی جیسے ہو آوازوں کے محشر میں اکیلا

خالد علیم

ایک کنارہ جنوں ، ایک کنارہ ترا
یوں ہی کہیں کٹ گیا ساتھ ہمارا ترا
خیر نکل آئی تھی قدر کوئی مشترک
رات مری زندگی ، چاند نظارہ ترا
تیری صفت کیمیا، میرے مقدر میں راکھ
جسم مرا برگِ کاہ ، آنکھ شرارہ ترا
یہ جو اسیری نہیں اور اسیری ہے کیا
جاں پہ ترا اِختیار ، دل پہ اِجارہ ترا
ایک ازلی درد سے شام اُٹھائی گئی
ایک ابدی شام نے خواب اُتارا ترا

کیا خبر، اس گھر کی دیواروں کی بنیادوں میں کیا ہے
یا پُرانا روگ ہے یا میں ہوں منظر میں اکیلا
آج بھی پورا جھلس جانے سے پہلے رہ گیا ہے
آخری اک معرکہ جگنو کے شہپر میں اکیلا
میں نہیں خالدؔ! کسی آواز کا یہ معجزہ ہے
اک دیا ہے اور ہے اس رات کے ڈر میں اکیلا

کیا تھی حقیقت نہ پوچھ، اس کی اذیت نہ پوچھ
کیسے گوارہ کیا ہم نے خسارہ ترا
اے فلکِ ہجر دیکھ، دیکھ مری آنکھ سے
کتنی تگ و دَو کے بعد بوجھ اُتارا ترا
خالد اگر زندگی ، تجھ کو فقط ایک تھی
کیسے خیال آ گیا مجھ کو دوبارہ ترا

''نیا باورچی خانہ''

''ساجدہ پہلا باورچی تمہیں پسند نہیں آیا تھا....آج نیا باورچی آئے گا.....اس کا پورا انٹرویو لینا اور چند کھانے پکوا کر ٹیسٹ بھی لے لینا....ہے بڑا ہی دیکھا بھالا ہے...ورنہ تم تو جانتی ہی ہو زمانہ کس قدر خراب ہو گیا ہے.....نبیل نے دفتر جاتے ہوئے ساجدہ کو تنبیہ کی''۔

ساجدہ غور سے نبیل کی باتیں سن رہی تھی...بولی۔

''آپ فکر نہ کریں...کھانے بنوا لوں گی.....بلکہ آپ ڈرائیور بھیج دیں۔ کھانا دفتر بھیج دوں گی۔

کھانا بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے...پہلے معلوم تو ہو جائے کہ ہمارے مطلب کا کھانا بنا سکتا ہے کہ نہیں.....مجھے تو تمہارے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے...کاش تمہیں بلڈ پریشر نہ ہوتا تو ہیلپر (Helper) کے ساتھ کھانا اچھا بنا سکتی----''

''اب جائیں.....زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے...آپ کا آفس وقت پر جانا ضروری ہے''۔

''توبہ ہے.....ہر بات کا کتنا خیال کرتی ہو...جا رہا ہوں...بس دس بجے باورچی آ جائے گا''۔

''جی بہت اچھا''.....ساجدہ نے بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھمایا اور سی آف کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ صفائی کے لئے عورت کام کرنے کیلئے آ چکی تھی...اس کے حوالے کمرے کی صفائی کی اور خود ساجدہ نے لاؤنج میں بیٹھ کر سوچا نبیل کو نہ جانے کئی مہینوں کے بعد باورچی کہاں سے ملا....ضرور جان پہچان کا ہوگا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی...موسم خاصا سرد ہو گیا تھا...ہیٹر کو آن کیا اور ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگی...باہر گھنگھور گھٹائیں برس جانے کیلئے تیار تھیں.....یکا یک موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ شیشوں کے دروازوں سے سرسبز سبزہ اور گھنے درخت تیز ہواؤں کی وجہ سے جھوم رہے تھے...موسلا دھار بارش ہونے لگی...ساجدہ سوچنے لگی۔ بارش اس کا راستہ روک لے اور شاید باورچی نہ آئے...ابھی اس نے اتنا ہی سوچا تھا کہ باورچی سائیکل پر سوار ایک ہاتھ میں چھاتا پکڑے ہوئے تھا۔ پورچ کے ایک کونے پر سائیکل اور چھاتے کو بند کر کے اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

ساجدہ نے نوکرانی کے بجائے خود ہی دروازہ کھول دیا۔ السلام وعلیکم۔

بلقیس ریاض

''آپ... جی میں باورچی ہوں''... ساجدہ نے اس کی جانب دیکھا... بھاری بھرکم ساٹھ یا پینسٹھ سال کا شخص سر پر ٹوپی پہنے چہرے پر ماسک لگائے ساجدہ کو دیکھنے لگا۔ ساجدہ نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور کہا اپنا ماسک نیچے کرو۔ اس نے ماسک نیچے کیا اس کے چہرے پر داڑھی تھی اور آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک تھی۔ جیسے میں بہت بڑا باورچی ہوں۔

''اچھا... باورچی ہو''۔

''ہاں جی''

''نبیل نے بھیجا ہے''

''ہاں جی بالکل''

''آجاؤ... دروازے کا ایک پورا پٹ کھول کر اس نے اندر آنے کیلئے کہا۔ ساجدہ نے باورچی خانہ میں لیجانے کے بجائے لاؤنج میں ایک چھوٹے سے سٹول پر بیٹھنے کیلئے کہا''۔

وہ بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا''

''جی بشیر''

''اچھا کہاں کام کرتے تھے''۔

جی میں ایک جج صاحب کے گھر کام کرتا تھا... تقریباً 28 سال کام کیا ہے۔

''کیا''... ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔

''28 سال''

''جی''

''جہاں ملازمت کی تھی وہاں گھر میں کتنے فرد تھے''... وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوا۔

''دو بیٹیاں تھیں وہ باہر کے ملکوں میں رہتی تھیں... بیگم صاحبہ دس سال پہلے بہت بیمار ہوئیں تھیں اور تقریباً آٹھ سال وہ بستر پر رہیں... اور فوت ہو گئیں''۔

''اچھا... پھر''۔

پھر جج صاحب اکیلے رہ گئے میں نے بیگم صاحبہ کے فوت ہونے کے بعد پانچ سال ان کی خوب خدمت کی... پھر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ساجدہ نے یہ سن کر بے اختیار کہا۔

''بہت افسوس ہوا... پھر کہاں ملازمت کی''۔

''جی تب سے فارغ ہوں''۔

گزر اوقات کیسے ہوتی ہے۔

میں محنت مزدوری کر لیتا ہوں... رزق تو اللہ کی ذات دینے والی ہے۔

''چلو... یہ سب باتیں تو ٹھیک ہیں... اب کام کی باتیں ہوں گی... 28 سال میں کیا کیا... ڈشیز بنا لیتے تھے''۔

وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

''جی اللہ کے فضل سے سب چیزیں... بنا لیتا ہوں... مثلاً آلو گوشت، بھنڈی گوشت، چکن کڑاہی، مٹن کڑاہی... ساجدہ نے اس کی بات کاٹی... پھر تو ہر ڈش بنا لیتے ہو۔

ہاں جی... ہاں جی... بیگم صاحبہ بالکل ہر چیز بنا لیتا تھا۔

''اچھا... پھر گوشت... اور آلو وغیرہ کچن میں رکھے ہیں... پیاز لہسن بھی... سامنے ہی گھی وغیرہ نظر آجائے گا آؤ میرے ساتھ بتا دیتی ہوں... پہلے آلو گوشت... اور بھنڈی بنا کر دکھاؤ... باقی کی ڈشیز کل بنواؤں گی''۔

آپ بالکل فکر نہ کریں... آرام سے کتاب پڑھیں بس چیزیں جہاں جہاں رکھی ہیں بتا

دیں.... دیگچی بھی کہاں ہے۔ ساجدہ نے سب کچھ بتادیا اور لاؤنج میں آ کر کتاب پڑھنے لگی۔
بچے سکول جا چکے تھے.... اس وقت فارغ وقت تھا وہ کتاب میں محو ہو گئی۔ ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ اس کے پاس آیا.. اس نے دیکھ کر کہا۔
''کیا مسئلہ ہے''؟
''جی.... اگر باورچی خانہ میں آجائیں تو کتنا مرچ مصالحہ اور تیل ڈالنا ہے''۔
ساجدہ اس کے ساتھ باورچی خانہ میں گئی... اور بتایا۔
مرچ مصالحہ تیز اور نہ ہی ہلکا رکھنا... یعنی درمیانہ۔
دیگچی میں پیاز اس نے سرخ کرنے کیلئے ڈالا ہوا تھا.. ساجدہ نے مرچ مصالحہ کا پیمانہ بتا دیا... اور پھر لاؤنج میں آکر کتاب کھول لی... اور بشیر نے بھنڈی کاٹ کر دوسرے چولہے پر بنانے کیلئے تیاری شروع کر دی.. ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ باورچی خانہ سے نکلا اور ساجدہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ساجدہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اس سے پوچھا۔
''ہاں بتائیں''
''جی.. کھانا بن گیا ہے آپ ٹیسٹ کر لیں''۔
''اچھا اتنی جلدی''.... ساجدہ ایک دم سے خوش ہو گئی.. سوچنے لگی یہ تو اچھا باورچی دکھائی دے رہا ہے... اتنی جلدی کھانا بنا لیا ہے... پھر ہانڈیوں کو دیکھ کر ساجدہ نے پوچھا۔
''اچھی روٹی بھی بنا لیتے ہو''۔
''جی'' وہ کچھ گھبرایا... اور دھیرے سے بولا۔
روٹی وہ باہر سے منگواتے تھے۔
''کیا—''
28 سال کام کیا ہے... کمال ہے انہوں نے ایک مرتبہ تو روٹی بنوائی ہو گی۔
''جی.... بس چاول بنا لیتا تھا.... ہندوستانی تھے.... زیادہ تر مچھلی کھاتے تھے''۔
ساجدہ دل ہی دل میں سوچنے لگی.... یہ تو ادھورا باورچی ہے روٹی ہی نہیں بنا سکتا۔
پھر وہ باورچی خانہ میں پکے ہوئے سالن کے ڈھکن کھول کر کھانا چمچ کے ذریعے ٹیسٹ کرنے لگی... ایک دم سے پریشان ہو گئی.... کھانا نہایت ہی بدمزہ تھا۔
اس نے پریشانی سے کہا۔
''28 سال کام کیا ہے وہ بھی ایک جج کے گھر کیا وہ اتنا بدمزہ کھانا کھاتے تھے''۔
''دراصل ناراض نہ ہوں.... میں پہلے دن کیسے جان لوں کہ آپ کیسا کھانا کھاتے ہیں۔ بس ایک دن میرے ساتھ کام کریں مجھے اندازہ ہو جائے گا اور دوسرے دن ویسا ہی بنا لوں گا۔ فکر نہ کریں مجھے سب کچھ آتا ہے روٹیاں بھی بنا لوں گا''۔
ساجدہ کا دل بیٹھ سا گیا... اتنی مہنگائی میں گوشت اڑھائی ہزار کلو کے قریب مل رہا تھا اس نے کھانا... بالکل بھی اچھا نہیں بنایا تھا۔
رات کو نبیل نے جب پوچھا.. تو ساجدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
''کیا ہوا ہے''۔
''بس.... بہت ہی اناڑی ہے''۔
ارے جج صاحب کے گھر 28 سال کام کیا ہے اناڑی کیسا ہوا...'' اچھا کھانا کھا کر دیکھ لو''۔ نبیل اپنی کرسی ساجدہ کے قریب

لاتے ہوئے سرگوشی سے بولا۔
پہلا دن ہے.... ایک دن اس کے ساتھ پورا باورچی خانے میں گزارو بڑا لائق باورچی ہے۔ قابل اعتبار بھی.. بس دوسرے دن وہ خود ویسا کھانا بنا لے گا۔
دوسرے دن ناشتہ کے بعد جونہی وہ آیا وہ ساجدہ بھی باورچی خانہ میں آ گئی.... اور اس کو اپنے کھانے کا سٹائل اور مرچ مصالحہ ڈال کر بتانے لگی... اور کہنے لگی۔
"بس تم ساری ریسپی (recipe) لکھ لو"۔
جی مجھے لکھنا نہیں آتا۔
وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔
"کیا... موبائل پر میسج بھی نہیں پڑھ سکتے"۔
"جی نہیں.... بس کوئی کوئی لفظ اردو کا پڑھ سکتا ہوں رات کو پرچے پر لکھ دیا کریں"۔
وہ دل ہی دل میں تلملائی.... اب لکھنے پڑھنے کی بجائے پرچے پر کھانوں کی ترکیبیں لکھوں.
ساجدہ کو پریشان دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
جی... پریشان نہ ہوں.... سب کچھ بنا لیتا ہوں... پھر وہ مسلسل پانچ گھنٹے کچن میں کھانا اس کے ساتھ بناتی رہی اور کھانا کافی حد تک مزیدار بن گیا۔ رات کو نبیل کھانا کھاتے ہوئے بولا۔
دیکھا بالکل تمہاری طرح بنا ہے... بس جلد اس کو پتا چل جائے گا۔ میرے خیال سے اچھا کھانا پکائے گا۔
"خاک پکائے گا اگر خود نہ پکاتی تو اتنا وقت نہ لگتا بس ہر بات بار بار پوچھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں ایسا بنا لوں گا۔ مجھے آتا ہے... اور پانچ گھنٹے مسلسل کچن میں کھڑے ہو کر میری ٹانگیں دکھ رہی ہیں اور بی پی بھی ہائی ہو گیا ہے۔
ساجدہ.. نیکی کا کوئی زمانہ ہی نہیں تمہاری اس بیماری کی وجہ سے میں نے یہ باورچی چنا ہے... بہت شریف ہے۔ شرافت... ایک طرف اگر ایسا کھانا خود سے بنائے گا تو میں رکھ لوں گی... ورنہ کوئی اور ڈھونڈیں۔
"تم تو جانتی ہو... آجکل لوگ بہت فراڈ ہیں... بس ایک ہفتہ محنت کر لو... پھر تمہیں آرام ہی آرام ملے گا"۔ نبیل نے مزے لے کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
دوسرے دن جونہی بچے سکول گئے تو بشیر نے آتے ہوئے کہا۔
"آج.. آپ آرام کریں میں کھانا بنا لوں گا"۔
لیکن ویسا ہی بناؤ گے جیسا میں نے مل کر بنایا تھا۔
"ہاں جی فکر نہ کریں مجھے ایسا کھانا بنانا آتا ہے... بنا لوں گا"۔ پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
"اچھا... بناؤ... اور یہ تمہارا ٹیسٹ ہے... اگر ویسا بنا لو گے تو ہم تمہیں رکھ لیں گے"۔
وہ ڈھٹائی سے جواب دیتے ہوئے گویا ہوا۔
"میں بنا سکتا ہوں.... ہاں جی.... ہاں جی.... بنا لوں گا... فکر نہ کریں"۔ شاید... ہاں جی... اس کا تکیہ کلام تھا۔
"فکر کیوں نہ کروں اتنی مہنگائی ہے۔ گوشت اور سبزیاں مفت تو نہیں آتیں... سوچ لو... اگر صحیح بنا لو گے تو کچن میں نہیں آتی"۔ وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے۔ چلیں باجی آج مل کر بنا لیتے ہیں... پھر کل میں خود سے بنا لوں گا۔ آخر 28 سال میں نے وہاں کام کیا ہے۔

"اچھا... باتیں کم کرو... اور آج غور سے دیکھنا کھانا کیسے ہمارے مطلب کا بنتا ہے"۔
"جی بہت اچھا"۔
آج بھی ساجدہ نے پانچ گھنٹے کچن میں گزارے اور اپنے کمرے میں آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی... صفائی کرنے والی لڑکی بڑی ہوشیار تھی اس نے بلڈ پریشر کا آلہ لگا کر پریشر چیک کیا... اور بولی۔
"آپ کا بی پی تو بہت ہائی ہے"۔
ساجدہ کو دوا دے کر آرام کرنے کے لیے کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔
کئی روز تک ساجدہ کا بی پی ہائی رہا... اب نبیل نے بشیر کو کہا کہ باجی تمہاری بیمار ہو گئی ہے... اور ٹھیک سے کھانا بنانا۔
"ہاں جی بہت اچھا... بیگم صاحب بھی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں... گھر میں صرف میں ہی تھا جو صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت کرتا تھا... اور اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتا تھا۔
اگلے روز بشیر نے خود سب کچھ بنایا... آلو گوشت میں پیاز اور ٹماٹر تیرتے ہوئے یوں لگتا تھا دریا میں رقص کر رہے ہوں... چار پانچ روز ساجدہ مغز ماری کرتی رہی تھی۔ کھانا قدرے ٹھیک بنتا رہا مگر آج تو اتوار کا روز تھا نبیل کا موڈ آف ہو گیا۔
پراٹھا بنا سکتے ہو... "جی بنا لیتا ہوں"... پھر انڈے کا آملیٹ بنا کر پراٹھا بنا دو... وہ جھٹ سے گویا ہوا۔
ہاں جی... ہاں جی... بنا سکتا ہوں... مجھے بنانا آتا ہے... اور کچن میں چلا گیا... پراٹھا سوکھی لکڑی کی طرح بنا ہوا تھا اور آملیٹ میں مرچ اور نمک کی بہتات تھی۔ نبیل نے ایک نوالہ کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔
ساجدہ نے نبیل سے کہا۔
میرے خیال سے اسے فارغ کرو... کوئی اور باورچی ڈھونڈو۔
"ابھی نکالنا مناسب نہیں رہے گا... پہلے کسی اور کا بندوبست کر لوں تو پھر اس کو نکال دوں گا۔ شاید یہ بنانا سیکھ جائے"۔ ساجدہ نے دل ہی دل میں کہا۔
مشکل ہی ہے جو یہ سیکھے... اور ساجدہ نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ کوئی کام اگر کہا ہے تو آدھی بات سمجھتا ہے اور آدھی نہیں... مثلاً اس کو پانی لانے کیلئے کہا تو باورچی خانہ کے سٹول پر بیٹھ گیا... ہر بات غور سے نہیں سنتا تھا... جب دوبارہ کہا جاتا کہ پھرتی سے کام کیا کرو تو بھاگ بھاگ کے کچن میں جاتا... غرض کے دو مہینے میں اسی طرح کا سلسلہ جاری رہا... ساجدہ کچن میں ساتھ کام کرتی تو کھانا ٹھیک بنتا۔ جونہی اس کو کہا جاتا کہ تم نے اکیلے بنانا ہے تو وہ بنا لیتا مگر بناتے بناتے بھول جاتا کہ کل کھانا کیسے بنا تھا... اچھا نہیں ہوتا تھا پھر وہ... اس کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا نہ کھاتی۔ بچے الگ سے ناراض تھے گھر کا شیرازہ بکھر گیا... نبیل اس کی غربت دیکھ کر خدا خوفی کرتے ہوئے اسے نکالتا نہیں تھا۔
شام کا وقت تھا... ساجدہ لان میں بیٹھی تھی۔ ابھی ہلکی ہلکی دھوپ تھی موسم نہایت ہی خوشگوار تھا۔ بشیر... کچن سے نکل کر لان میں آیا... سرو کے درخت سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔
"باجی" وہ چونک اٹھی۔

ساجدہ نے دیکھا تو سامنے کھڑا تھا... موسم بڑا ہی اچھا ہے. آپ پکوڑے چائے کے ساتھ کھائیں گی- ساجدہ ایک دم خوش ہو گئی تمہیں پکوڑے اچھے بنانے آتے ہیں-

"ہاں جی... ہاں جی"- پھر اس نے وہی لفظ دہرائے-

"اچھا"... ساجدہ نے اس کی جانب دیکھا-

"بنا لیتے ہو"-

"جی... ان کے گھر بہت بناتا تھا"-

"اچھا لے آؤ"... آدھے گھنٹے کے بعد پکوڑے اور چائے لے آیا... ایک پکوڑا منہ میں ڈالا اور بشیر کو دیکھا- وہ مسکرا رہا تھا... اور بھرپور اعتمادی کے ساتھ چمکتی آنکھوں کے ساتھ ساجدہ کو دیکھ رہا تھا-

"یہ کیا بنایا ہے"-

"جی.... پکوڑے.... بیگم صاحبہ شوق سے کھاتی تھیں.... مگر بیچاری آٹھ سال چارپائی پر پڑی رہیں اور مر گئیں"-

اچھا... پھر... صاحب کا کیا بنا-

جی ان کے بعد وہ پانچ سال زندہ رہے... چارپائی پر پڑے تھے. میں نے خوب خدمت کی اور وہ بھی پانچ سال کے بعد مر گئے-

میرا خیال ہے وہ کھانا نہیں کھاتے ہونگے جوس وغیرہ یا سوپ پیتے ہوں گے.

"نہیں جی.... وہ قیمہ، گوشت مچھلی سب کچھ کھاتے تھے... مگر بس اللہ نے بلا لیا وہ بھی چلے گئے. ساجدہ نے اینٹ کی طرح سخت پکوڑا منہ میں ڈالا... اور چبانے کے بجائے منہ سے نکال کر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا-

بشیر آٹھ سال تمہاری بیگم چارپائی پر پڑی رہی اور اسی طرح کے کھانے کھاتی رہیں اور پانچ سال میں صاحب بھی چل بسے-

ساجدہ نے پوچھا کیا تم ان کو بھی ایسے ہی پکوڑے بنا کر کھلاتے تھے؟

بشیر نے بڑے وثوق سے جواب دیا-

ہاں جی... ہاں جی بیگم صاحبہ میں ان کو بھی ایسے ہی... بالکل ایسے ہی.... پکوڑے بنا کر کھلاتا تھا. ساجدہ پریشان ہوتے ہوئے کہنے لگی دل تو نہیں کرتا کہ تمہیں جواب دیں- مگر ہمارے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں.... ہم نے جینا ہے.... مرنا نہیں... ان کو ہماری ضرورت ہے. براہ مہربانی چلے جاؤ.... اور کل اپنی تنخواہ لینے کیلئے آ جانا... وہ ٹپٹا گیا... نہیں جی میں سب کچھ بنا لیتا ہوں... سب کچھ بنا لیتا ہوں... اچھا بنا لیتا- مجھے مت نکالیں. خدا کیلئے مت نکالیں خوب خدمت کروں گا. جیسی خدمت ان کی کی ہے. ایسا کھانا کھلا کر مار ڈالا-

"نہیں تم جاؤ اور ابھی اسی وقت جاؤ"... ساجدہ نے غصے سے کہا...... میں کہتی ہوں جاؤ-

اور ڈر کے مارے گیٹ کی طرف بھاگا-

ساجدہ نے اس کو جاتے دیکھا تو اس نے محسوس کیا جو ذہن پر غبار تھا... وہ آن کی آن میں چھٹ گیا ہے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اندر جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو باغ کا نظارہ بڑا ہی دلفریب لگنے لگا اور اس نے محسوس کیا اس کا بی پی بھی اب نارمل ہو گیا ہے-

☆☆☆☆☆

"مُڑ کے نہ دیکھو دلبروُ"

دردانہ نوشین خان

ہماری شادی کو بیالیس سال ہو گئے۔

ہمارا ہمیشہ یہ معمول رہا رات کو فرصت کے وقت میں کبھی صحن، کبھی اَپر فلور، کبھی چھت تو کبھی ٹیرس (مختلف ادوار کے گھروں کے مطابق) نلعون پٹی کی نرم چارپائیوں پہ لیٹ کر دن بھر کی تھکن سے ذہن و جسم کو آزاد کرتے ہوئے گپ شپ کرتے۔ ہمیں یہ پُرسکون وقت اچھا لگتا تھا۔ میں پوسٹ ماسٹر جنرل رہا ہوں۔ نیلی ہائی سکول میں پڑھاتی رہی جب تلک ہماری نوکریاں تھیں ہماری گفتگو جاب کی روئیداد ہوتی۔ ہمیں ایک دوسرے کے کولیگز، گروپس اور ماحول کا مکمل تعارف ہوتا تھا۔ ہمارے تین بچے ہیں ایک بیٹا دو بیٹیاں اب تو خیر سے سب گھر بار والے ہیں۔

اب ہماری زندگی کے کلینڈر میں رونق کا سرخ دائرہ اُن تاریخوں پر ہوتا ہے جب اِن تینوں میں سے کسی نے آنا ہوتا ہے ہم اُن کی آمد پر خوش اور پُر جوش ہوتے ہیں تاہم اُن کے جانے پر راضی اور قانع رہتے ہیں۔ اس عمر میں ضد، بے جا دکھ، جذباتی پن کے روگ ختم ہو جاتے ہیں۔ نیلی نے کہا۔

"حاشر...... میں سوچ رہی ہوں میرے والد

صاحب کے زمانے میں بی اے بڑی تعلیم سمجھی جاتی تھی اور دادا صاحب کے زمانے میں تو نیم پلیٹ پر نام کے ساتھ بی اے لکھا ہونا رُتبہ بڑھا دیتا تھا۔ جیسے آج کسی کی نیم پلیٹ پہ بیورو کریٹ عہدہ درج ہو۔"

"بالکل ایسا ہی ہے..... تب تو میٹرک کو مشکل امتحان گردانا جاتا تھا۔ میرے دادا جی بتاتے تھے وہ دسویں کے امتحان میں گایا کرتے تھے۔

"Ratalisation (رٹا لگانا) is Foundation in the days of Matriculation Examination"

"اور ہمارے والے دور، میں ایم اے / ڈبل ایم اے پڑھائی کی اخیر تھی اور اب M.Phil کے بعد PHD ایک سلسلہ ہے جو رُکتا ہی نہیں"

"یار تم MBBS کو دیکھ لو۔ ہماری نوجوانی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر انگلیوں پہ گنے چنے تھے اب ہر گھر سے چار چھ نکل آئیں گے۔ نیلی کہتی۔

"مگر ترقی نہ ہوئی..... اسے کیا کہیں زوال یا کمال" میں نے ساتھ رکھی ٹھنڈے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولا۔

اور لیٹے لیٹے منہ میں اُنڈیلا، وہ پھر بولی

"میں سوچتی ہوں ہمارے پوتوں نواسوں کا کیا ہوگا"

میں نے آسمان پر تارے کم ہونے کی بات کی۔ یہ بات اکثر ہوتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔

"ایک اور عجیب بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بجائے اس کے وقت کے ساتھ دعائیں کم ہو جائیں..... یعنی شادی، اولاد، اولاد کا پاؤں پہ کھڑا ہونا سب تو ہو گیا..... مگر دعائیں بڑھتی جاتی ہیں۔"

"میری تو دعائیں محدود ہو چکی ہیں..... اب نہ خواب نہ تعبیر....."

"تم مَردوں کی دُنیا جوانی تک ہوتی ہے آگے بھی جیتے ہیں تو جوانی تلاش کرتے ہیں....." اُس کے غصّے پہ ہنسی آگئی۔

"یار ..... اب مغفرت کے سوا کیا مانگنا ہے۔" میں نے ٹھنڈا ٹھار جواب دیا۔

"بندہ اللہ کے دَر کا مستقل منگتا ہے..... پہلے ہمارے پیاروں میں والدین بہن بھائی تھے پھر اولاد شامل ہوگئی اب اولاد کی اولاد شامل ہو گئی بلکہ داماد اور بہو کی پریشانیاں اپنی پریشانیاں بن جاتی ہیں۔ سب کی خیر سب کا بھلا کا مطلب اب سمجھ میں آیا ہے۔"

"ہاں، کہتی تو تم ٹھیک ہو، پچھلے دنوں جی

(جیسے پوتی کا رِنگ نیم) کی بیاری نے ہاتھ پاؤں پھلا کے رکھ دیے تھے۔"

"میں تو پوتوں نواسوں کے گفٹ سوچتی رہتی ہوں...... گفٹ پا کر بچے کتنے نہال ہوتے ہیں۔"

میرا موبائل بجا میں اُدھر متوجہ ہوا۔ وہ چڑ گئی۔

"ہر میسج فوراً دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

ہمارے درمیان طے تھا جب بات ہو رہی ہوگی موبائل پہ کوئی نہیں لگے گا۔

موبائل تو ایسا نشہ ہے اُٹھا تو اِدھر اُدھر کلک کرتے، وقت کا پتا نہیں چلتا نہیں جو سوچ رہا تھا نیلی نے کہہ دیا۔

"حاشر...... نماز میں نیند آنے لگتی ہے۔ تسبیح پہ سر جھومنے لگتا ہے تلاوت میں آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں...... مگر موبائل دیکھتے جمائی تک نہیں آتی، حتیٰ کہ آنکھیں تھک جاتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے آنکھوں میں رتی بھر ایمان باقی ہے......"

"پوائنٹ تو ہے" وہ ہنسنے لگی۔

باتیں چھوٹی چھوٹی سی، بے تکی، تُک والی بھی...... اب تو وہ بہت یاد آتی ہیں۔ اتنی سہانی لگتی ہیں جیسے کانچ دور کی نقلی انگوٹھی جسے جھوٹ بول کر کسی کا تحفہ کہا جائے......

"تمھیں محسوس ہوئی خوشبو؟" نیلی ہمیشہ چونکا دیتی تھی۔

"کیسی خوشبو؟"

"ایک لہر کی طرح ابھی ابھی آئی ہے...... مر وہ کی جھاڑیوں سے......"

"تمھیں کیسی لگی یہ خوشبو"

"مجھے ایسے لگا میں نے تمھارا کُرتے اور بلیو سوہنگر بُن کر مکمل کر لیا ہے اور اُسے میز پہ بچھا کر دیکھ رہی ہوں...... اور میرے کمرے کی کھلی کھڑکی سے تم جھانک رہے ہو اور جیسے باورچی خانے سے میری ماں کی زندہ آواز کی مہک آ رہی ہے اور تین دن بعد عید آنے والی ہے۔"

وہ بولے جا رہی تھی اور میری آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ میں بولنا نہیں چاہتا تھا کہ اُسے پتا چل جائے گا میں کتنا احمق ہوں رو رہا ہوں۔" کمزوری نہیں دکھانا چاہتا تھا میں نے کھنگار کے کہا۔

"رات کی ہوا میں آلودگی کم ہوتی ہے...... دھول دھواں نہیں رہتا۔ اس لیے فطری خوشبو میں ناک محسوس کرتی ہے...... دن میں یہاں بیٹھیں تو سب کچھ اوپری ہوگا عام سا مختلف......"

"ھووں......" اُس کی "ھوں" لمبی کھچی۔

یہ نہیں تھا کہ ہم میاں بیوی میٹھے بول ہی بولتے تھے...... یا نیلی کے بقول 'لطیف باتیں' کرتے تھے...... البتہ لطیف باتیں یاد رہ جاتی ہیں......

اور مجھے یاد آئے جا رہی ہیں۔
نیلی کو میری بھابی کی ایک بہن کا آنا اچھا نہیں لگتا تھا، کچھ معالات میں عورت کی چھٹی حس مرد سے زیادہ ایکٹو ہوتی ہے، نہیں میں نے غلط کہا عورت کی ایکٹو ہوتی ہے مرد کی More Active ہوتی ہے۔ مجھے بھی اندازہ تھا بھابی کی یہ بہن۔ بہن بننا پسند نہیں کرتی (اللہ اُسے معاف کرے اور مجھے بھی)..... اُدھر میری چھٹی حس میں لال بتی جلتی تھی جب نیلی کا ڈائریکٹر ایجوکیشن اسے اپنی کتاب پیش کرتا تھا۔ کتنے ستم خوردہ بچارے سے ہوتے ہیں ہم، اب ہنسی آتی ہے ایک دور کی بات تھی، نہیں رہی، ہم ایک دوسرے کے لیے خطرہ نہ رہے۔
''بندے کی دوڑ کی ایک لمٹ ہوتی ہے'' میں نے گاؤ تکیہ پُشت کے پیچھے لگایا۔
''میں سمجھی نہیں'' اُس نے تپائی پر چائے کے کپ رکھے
''اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہماری بصارت کی ایک لمٹ ہے۔
''یہ تو ہر جسمانی قوت میں ہے ہم چیتے کی طرح بھاگ نہیں سکتے عقاب کی طرح دور سے نہیں دیکھ سکتے۔''
''انسان اور جانور کا مقابلہ چھوڑو..... میں صرف انسان کی بات کر رہا ہوں۔''
''تو کرو'' وہ چائے کا کپ لیے ریلنگ پر جھک کر سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کو تانک جھانک میں بڑا مزہ ملتا ہے۔
''سکون سے بیٹھو گی تو کروں گا'' میں بھنا گیا۔
''ارے حاشر صاحب..... کتنے کروڑ کی لاٹری نکلی ہے..... بتائیں'' وہ اپنی کُرسی پر آ بیٹھی۔''
''لاٹری نکلنا ایک خبر ہے..... ایک بڑی خبر ..... شہ سرخی مگر یہ گہری بات نہیں ہے۔ میں کہہ رہا تھا عام انسان کی ایک لمٹ ہوتی ہے حد ہوتی ہے..... گناہوں کی بھی اور..... نیکیوں کی بھی.....''
'' لمٹ کراس کرتے دیر نہیں لگتی جناب..... یہ بھی اللہ کی عطا کردہ توفیق ہے کہ وہ لمٹ میں رہ جائے۔''
''یہ تو ٹھیک ہے سولہ آنے سچ کہہ رہی ہو..... مگر میں سوچ رہا تھا فلرٹ کرنے والا آخر کتنے فلرٹ کرے گا..... چھوٹا چور چھوٹا کمینہ..... گپ باز جھوٹا..... نماز کا بھگوڑا..... ادھیڑ عمر تک مونچھیں رنگ کر خود کو جوان رکھنے والا..... یہ جو عام بندہ ہوتا ہے اس بچارے کی دوڑ لمبی نہیں ہوتی..... کہیں ماں کی دعا، کہیں باپ کی شرافت، کہیں والدین کی تربیت اُستاد کی نصیحت، کوئی نہ کوئی دبی ہوئی چنگاری کسی وقت روشنی دکھا دیتی ہے۔''
میری بات سُن کر نیلی چائے کا کپ تھامے

سوچتی رہی، پھر مسکرا کر داد دی۔

''آج تو حاشر خاں حیران کر دیا، اشفاق احمد، بابا عرفان واصف علی واصف کے پائے کی بات کی۔''

میرا سینہ چوڑا ہو گیا۔

''لیکن...... یہ عام بندہ اتنا سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ سیدھا تب ہوتا ہے جب تک بڑھاپا دستک نہیں دروازہ دھڑ دھڑانے لگتا ہے، پہلی دوسری ہلکی دستک پہ تو یہ عام بندہ ٹال مٹول سُنی اَن سُنی کرتا رہتا ہے......''

''دھڑ دھڑ...... دھڑام۔'' میں نے دونوں بازوؤں کو ہلایا تو تپائی ٹکرا کر گر گئی اور اس بات پہ ہم نے بہت قہقہے لگائے۔

اُس قہقہے لگانے والی دھنک رنگ شام سے اگلے دن میرا موٹر بائیک سے حادثہ ہو گیا۔ ہڈیوں کی تو بچت ہو گئی مگر بڑھاپے کی چوٹیں تھیں چار دن ہسپتال پڑا رہا۔

گھر آیا تو رشتہ دار، احباب، محلہ دار مزاج پُرسی کو آنے لگے۔ روٹین کی نشستیں برخاست ہو گئیں۔ ویسے تو گزشتہ چالیس سالوں میں بھی یہ بات کی گپ شپ یہ شام بسری کا معمول کئی بار ٹوٹا، لمبے تعطل آئے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد یہ ہر دن کا حصہ بن گیا تھا۔ پر اب وہ مرا ایسا چھوٹا کہ ہاتھ ہی نہیں آیا۔ نیلی تھک کر جلدی سو جاتی تھی یا وہ معروف رہتی۔ ہمارے درمیان ایک لنک تھا جو نہیں رہا تھا۔ اس کی جُڑت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ہم اندر و اندر گُم ہو گئے تھے۔ پھر ہفتے مہینے بنتے گئے ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہوتے گئے۔

ضرورتیں پوری کرتے کرتے تھک کر سو جاتے اگلی صبح اپنی عمر کے حساب سے تازہ دم ہو کر ضرورتیں پوری کرنے پہ جُت جاتے۔ تھک جانے کی مظلومیت ایک دوسرے کو سناتے اور اس طرح بس ایک سال گزرا۔ اب حساب لگاؤں تو پورا ایک سال نہیں دس ماہ گزرے۔ دس ماہ میں ہم بوڑھے نہیں ضعیف ہو گئے۔ ہاں واقعی...... ہم سُست رو خاموش نڈھال مایوس ضعیف ہو گئے۔

صرف دس ماہ میں......

اور نیلی سبقت لے گئی۔ وہ چل بسی۔

پتا نہیں کہاں چل کر جا بسی......

اب جبکہ نیلی کی کُرسی، نیلی کی چارپائی خالی ہوتی ہے اور ریلنگ بھی خالی ہوتی ہے۔ میں ہر شام اُس کے ساتھ محفل بسا لیتا ہوں۔

''بیالیس سالہ رفاقت کے اَن گنت لمحات یاد نہیں آتے، یاد آ کر نہیں رُلاتے...... گزری مشترکہ شاموں کی یادیں، ہر شام آتی ہیں اور رُلاتی ہیں......

یہ مٹھی بھر ساعتیں شاید بیالیس سالوں کی رگِ جان تھیں مگر کیوں؟؟

☆☆☆☆☆

ابو عامر اور مسجدِ ضرار

نبیؐ کے مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبیؐ مدینے پہنچے تو اس کی مشیخیت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد وہ نعمتِ ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپؐ کو اپنی مشیخیت (بزرگی) کا حریف اور اپنے کاروبارِ درویشی کا دشمن سمجھ کر آپؐ اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔ پہلے دو سال تو اسے یہ امید رہی کہ کفارِ قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے کافی ثابت ہوگی لیکن جنگ بدر میں جب قریش نے شکستِ فاش کھائی تو اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ چنانچہ اسی سال وہ مدینے سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ جنگ اُحد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اُحد کے میدانِ جنگ میں وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبیؐ گر کر زخمی ہوئے تھے۔ پھر جنگ احزاب میں مدینہ پر چڑھ آنے والے لشکروں میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگ حُنین تک جتنی لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخر کار وہ مایوس ہو گیا کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رُخ کیا تا کہ قیصر کو اس ''خطرے'' سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لے نبیؐ کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔

ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا اور اس آخری تجویز میں یہ بھی یہ لوگ اس کے ہمنوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصرِ روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرار داد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنالیں گے تا کہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہوسکیں اور

پیروز بخت قاضی

آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں- بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں- یہ وہ ناپاک سازش تھی جس کے تحت وہ مسجد تیار کی گئی تھی جس کا ذکر سورۂ توبہ 9 میں یوں کیا گیا ہے:

"کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اور اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق) کو نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس ظاہری عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے- وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا- مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں- تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے رہو- اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں- پھر تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا جس نے اپنی عمارت ایک وادی کے کھوکھلے بے ثبات کنارے پر اٹھائی ہو جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور اوپر کا حصہ بے سہارا کھڑا ہو، جو عمارت اسے لے کر سیدھی جہنم میں جا گرے؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا- یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں اللہ نہایت باخبر اور دانا ہے-" (التوبہ 9: 107 تا 110)

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں- ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی اور دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی- ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو- انھوں نے نبیؐ کے سامنے یہ جواز پیش کیا کہ بارش اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً "ضعیفوں اور معذوروں کو جو پہلی دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینے میں آسانی پیدا ہو جائے- جب یہ مسجد ضرار تیار ہو گئی تو انھوں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں- مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے- اس مہم سے واپس آ کر دیکھوں گا- اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ ادھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو ادھر یہ فوراً عبداللہ بن اُبی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیں- لیکن تبوک میں مسلمانوں کی فتح نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا- واپسی پر جب نبیؐ مدینہ کے قریب ذی اوان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں-

☆☆☆☆☆

سانس لینا بھی تھا مشکل

رحیمو کا تعلق فتح آباد سے تھا۔ موناڈرین کے کنارے آباد فتح آباد کو زیادہ تر لوگ ککریاں والی کے نام سے جانتے تھے۔ ککریاں والا ایک عام سا گاؤں تھا ویسا ہی جیسا بیدی کے ناولوں میں ملتا ہے۔ کچھ پکّے باقی کچے گھر۔ بیچوں بیچ ایک بڑی حویلی۔ حویلی کے پیچھے کمی کمینوں کی کھولیاں اور مویشیوں کے باڑے۔ کچی گلیاں، لید ملی گرد، اپلوں کی مانوس سی سڑاند اور رلتے کھلتے ننگ دھڑنگ بچے۔ پہلی بار میں نے رحیمو کو احمد خان کی حویلی میں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ میرا کولیگ خالد فوجا اس گاؤں کے اریگیشن سسٹم کی بحالی کے لئے کام کر رہا تھا اور کسی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ مجھے وہ مشورے کے لئے لے گیا تھا۔ میرا شروع سے ایک اصول رہا ہے کہ کسی کی ورک سائٹ پر اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ وہ خود جانے کے لیے نہ کہے مبادا کوئی ایسی بات ہو جائے جو اسے ناگوار گزرے یا اس کے لیے شکوے کا باعث بنے۔

جون کی چلچلاتی دھوپ میں ہمیں کام کرتے کافی دیر ہو گئی تو اچانک ایک شخص کہیں سے نمودار ہوا اور احمد خان کی جانب سے حویلی میں آنے کی دعوت دی۔ اس کے اصرار کے باوجود ہم نے سختی سے معذرت کر لی۔ وہ بادل نخواستہ چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد ایک بہت موٹے شخص کے ساتھ پھر آتا دکھائی دیا۔ ''لو جی وہ خود ہی آ گیا ہے'' خالد نے مجھ سے کہا ''کون؟'' میں نے پوچھا ''احمد خان اور کون'' خالد نے جواب دیا ''اچھا تو یہ موٹو ہے احمد خان، گئے وقتوں کی طارق ٹرانسپورٹ والے کا بیٹا۔ طارق ٹرانسپورٹ ہمارے بچپن میں کوٹ مومن سے لاہور کے روٹ پر چلنے والی بس کمپنی تھی جو وقت کی پابندی کے لیے بہت مشہور تھی'' میں نے خود

ظہیر پراچہ

کلامی کے انداز میں اسے بتایا۔ اتنے میں وہ دونوں ہمارے قریب آ گئے۔ سلام دعا کے بعد اس نے گلے کے انداز میں کہا کہ ''صاب جی میں نے تو گرمی کے خیال سے آپ کو اتنی محبت سے بلا بھیجا تھا اور آپ نہیں آئے۔ اس خیال سے میں خود آ گیا ہوں۔ یہ تو کوئی گل نہ ہوئی نا کہ آپ اتنی گرمی میں ہمارے بھلے کے لیے کام کروا دو اور ہم پرت کر آپ کا خیال بھی نہ کریں۔'' ہم نے بہتیرا کہا کہ ہمارا ارادہ جلد کام ختم کر کے واپس جانے کا ہے مگر اس نے ہماری ایک نہ چلنے دی اور ہمیں ساتھ لے کر ہی ٹلا۔ حویلی زیادہ دور تو نہ تھی لیکن اس کے موٹاپے اور ٹپ ٹپ گرتے پسینے کے پیش نظر ہم نے گاڑی لے جانا مناسب سمجھا۔ ہم حویلی کی بیٹھک میں داخل ہوئے تو جیسے قرار آ گیا۔ اچھے وقت تھے تب گاؤں میں بھی پنکھے چلتے تھے۔ اس کے باوجود ملک کے اشارے پر دو ملازم دستی پنکھے بھی جھلنے لگے۔ میں نے مور چھل کے خیال سے مزہ لینے کے لیے آنکھیں موند لیں اور اپنی عادت کے مطابق لمحوں میں سو گیا ''صاب جی شربت لے لو'' کی آواز سے آنکھ کھلی تو لارڈ گیفر سے بھی دبلا شخص ٹرے لئے کھڑا تھا۔ میں نے شربت کا گلاس اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ٹرے چھلکی اور بھرا گلاس میرے سفید کپڑوں کو گلابی کر گیا۔ ''اوئے رحیمو انھا ایں بھونی رن دیا پترا''۔ ملک چیخا ''او دتو نپائیں اوئے میرا پڑلا''۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ فٹے سنگل پسلی رحیمو کے سر پر پڑے برسنے لگے۔ ملک پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ اس کے منہ سے جھاگ ملی گالیوں کا طوفان جاری تھا۔ مار رحیمو کو پڑ رہی تھی تکلیف مجھے ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے طور پر ملک کو روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔ مگر جب ساڑھے چھ فٹے خالد نے ملک کے پڑلا بردار بازو کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر کہا ''بس اوئے ملک صاب'' تو ملک کا اٹھا ہوا بازو وہیں معلق رہ گیا۔ عین اسی لمحے اچانک وہ ہو گیا جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ ہماری شہ پا کر پنج فٹے رحیمو نے کام دکھا دیا تھا یا خالد کی مضبوط گرفت کی وجہ سے ملک کے ہیجان کے باعث ڈب ڈھیلا ہو کر ملک کا تہمد سرک کر فرش پر آن گرا اور حویلی کے باہر پڑلوں کی دھمک دیکھنے کے لیے آئے بچوں کو ایک اور تماشہ مل گیا۔ ''ملک ننگا ای اوئے''۔ ایک بچے کے منہ سے یہ بات کیا نکلی کہ ملک کے منہ سے ایک بار پھر گالیوں کے چشمے ابل پڑے مگر اب ان کا رخ باہر کی طرف تھا۔ خالد کی گرفت مضبوط نہ ہوتی تو شاید ملک اسی عالم سرفروشی میں بچوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوتا۔ موقع پا کر رحیمو خوشی سے غائب ہو گیا۔ یہ تھی رحیمو سے میری تعارفی ملاقات۔

اس دن کے بعد میرا دوبارہ وہاں جانا نہ ہوا

مگر ایک دن وہ خود ہی میرے دفتر میں آ گیا اور سلام کر کے پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ''اٹھو بھئی کون ہو تم؟ میں پیر ہوں نہ صاحب جاگیر۔ کرسی پر بیٹھو یا سیدھے کھڑے ہو کر بات کرو''۔ کھڑا ہو کر اس نے نام بتایا تو گویا مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ ''صاب جی بہک کرم کرو۔ آپ کی نسلوں کو بھی دعائیں دیں گے۔ ہمارے پاس اسکے علاوہ ہے بھی کیا دینے کو'' اس کی آواز میں لجاجت اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اب سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس لیے وہ بڑی آس لے کر ملازمت کی بھیک مانگنے آیا ہے۔ ان دنوں ہم ایک نیا پراجیکٹ شروع کرنے والے تھے اور ہمیں کچھ لوگوں کی ضرورت تھی۔ میں نے محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے بیلدار رکھ لیا حالانکہ وہ فیلڈ ورک کے لیے بالکل موزوں نہیں تھا۔ وہ قسمت کا دھنی نکلا۔ ہمارا خانساماں رانجھا جلد ہی کسی بات کو دل پر لگا کر دنجھلی بجا تا رخصت ہو گیا اور یوں رحیمو کو کچن کے ذریعے ہمارے ذہنوں تک رسائی حاصل ہو گئی۔ اسے کھانا پکانا، باتیں بنانا اور کام نکالنا آتا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لیے اس کا طریق کار اس نائی سے ملتا جلتا تھا جو چوہدری کے سامنے اپنا مطالبہ اس وقت رکھتا تھا جب استرا عین اس کی شاہ رگ کے اوپر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر رحیم پراچہ اور شاہ جی کے ساتھ فلاش کی بازی پر بکرا داؤ پر لگا ہوتا یا ایسے مہمان آئے ہوتے جن کے سامنے ہم اپنا شملہ نیچا ہوتا نہ دیکھ سکتے، وہ کسی نہ کسی بہانے آ کر لجاجت سے اپنا مدعا بیان کر دیتا اور ہم شاہ رگ بچانے کے لیے اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھائی اور بہنوئی کے علاوہ دور دراز کے کئی رشتہ داروں کو بھرتی کروا لیا اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ مانک بھی انہی میں سے ایک تھا۔ مانک قد بت، رنگ روپ اور جسامت میں کہیں سے بھی مصلی نہیں لگتا تھا۔ چٹے کپڑے پہنا کر اسے چوہدریوں کی کسی بھی مجلس میں بٹھا دو، وہ انہی میں سے لگے گا۔ مانک کوئی اکیلا نہیں تھا ایسی اور بھی کئی صورتیں دیکھنے کو ملیں جو چوہدریوں اور مصلیوں کی شراکت داری کا واضح اعتراف تھیں۔ خود احمد خان کے گاؤں میں اس کا ایک رشتہ دار ایسا بھی تھا جو شکل، عقل، رنگ، کلام یا اطوار کہیں سے بھی چوہدری نہیں لگتا تھا۔ ان گنت مربعوں کا مالک، بے اولاد مگر شکل کے ساتھ دل کا بھی مصلی۔

ڈاکٹر پراچہ کے کہنے پر ریسٹ ہاؤس میں ہونے والی ایک پارٹی میں رحیمو کو کیا بھیجا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے ہی نکل گیا۔ فن اس کے ہاتھوں میں بھی تھا اور زبان میں بھی اور ان کے استعمال کا موقع محل بھی خوب

سمجھتا تھا۔ اب تو ہر دوسرے روز اس کے لیے بلاوا آنے لگا۔ پٹواریوں کے کندھوں پر بیٹھ کر تحصیلدار کے گھر کے رستے اس نے سیدھا اسسٹنٹ کمشنر کے باورچی خانے میں جا لینڈ کیا۔ یہاں آ کر اسے پر پرزے نکالنے کا موقع بھی ملا اور گل کھلانے کا بھی۔ اس کے مطالبے بڑھنے بھی لگے اور طلب کا انداز بھی بدلنے لگا۔ لجاجت کی جگہ شوخی لینے لگی۔ باہر تو سننے میں آیا کہ طلب کے ساتھ اس کے لہجے کی شوخی میں حکیمانہ رنگ بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ میرے لیے اب وہی ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ اب میں اس سے جان چھڑانے کے لیے کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ یہ موقع بھی جلد ہی آ گیا۔ ان دنوں ہم ایک وارہ بندی سٹڈی کی تیاری کر رہے تھے جس کے لیے ہمیں پورا ایک ہفتہ رکھ چراگاہ میں راؤنڈ دی کلاک موگھے سے کھیتوں تک پانی کا پیچھا کرنا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا کھویا کیا پایا۔ دسمبر کا مہینہ، کیمپ لائف، پانی سے دن رات کا واسطہ، سوچ کر ہی ہول اٹھتا تھا۔ اپنے میاں صاحب تو دسمبر میں لحاف سے واش روم کے سفر کو ہی سفر آخرت کے مترادف قرار دے رہے ہیں جبکہ ہمیں تو کھلے عام دسمبر میں پانی اور مٹی کا کھیل کھیلنا تھا دن کی خنک دھوپ اور رات کی یخ سردی میں ریتلی زمین پر مہندی کی جھاڑیوں کے بیچوں بیچ۔ پچھتر سالہ ڈاکٹر سٹڈی باورز کی حوصلہ افزائی اور ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں ڈاکٹر رحیم پراچہ کے تعاون سے ''رخصت بیماریہ'' پر چلا گیا ہوتا۔

جملہ انتظامات کے انچارج کی حیثیت سے ڈیوٹی روسٹر بناتے وقت میں پہلے ہی لیبر شارٹیج کا شکار تھا اوپر سے جب رحیمو مانک کو ایک ہفتے کی چھٹی دلوانے سفارشی بن کر آ گیا تو میرا ناریل بالکل ہی چٹخ گیا اور میں نے اسے وہ سنائیں کہ رہے نام اللہ کا۔ اور سختی کے ساتھ اسے آئندہ کسی بھی صورت میں آنے سے منع کر دیا۔ یہ سب ایسے وقت ہوا جب دیکھنے والے بہت تھے۔ اکثر کے چہروں سے بشاشت چھپائے نہ چھپتی تھی مگر میں نے دیکھا کہ مانک کی حالت بہت بری تھی۔ صرف آنسو نہیں گرے تھے ورنہ اس کا رونا واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے گیا تو ہر نوالے میں مانک کا روتا چہرہ میرے سامنے آ جاتا اور میں کھانا کھائے بغیر واپس آ گیا۔ دفتر میں آتے ہی میں نے محمد بخش کو مانک کو بلا لانے کو کہا۔ محمد بخش میرا نائب قاصد تھا۔ اس سے بڑھ کر ذہین شخص میں نے اس طبقے میں نہیں دیکھا۔ وہ جان گیا کہ میں ضمیر کی عدالت میں پیش ہوں اسی لیے جب وہ مانک کو لے کر آیا تو یہ کہہ کر چلا گیا کہ باہر سے دروازہ بند کر کے جا رہا ہوں تاکہ اور کوئی نہ آ سکے۔ ضرورت پڑے تو گھنٹی بجا دیں۔

اپنی کمزوری ظاہر کیے بغیر میں نے مانک

سے کہا ”مجھے صاف صاف بتاؤ قصہ کیا ہے؟“ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میں نے کچھ دیر تو اسے رونے دیا تا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو جاؤ اور پھر اسے کہا کہ جو بھی معاملہ ہو کھل کر اور سچ سچ بتا دے تا کہ میرے لیے جو بھی ممکن ہو میں اس کے لیے کر سکوں۔ اس کے منہ پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ صاف لگ رہا تھا جیسے وہ اس مخمصے میں ہے کہ بتائے یا نہیں اور بتائے تو کیا اور کیسے۔ میں نے گھنٹی بجائی اور محمد بخش کو اس کے لیے چائے لانے کو کہا۔ دراصل میں اسے اپنے خلوص کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ ابھی محمد بخش واپس بھی نہیں آیا تھا کہ اس نے بولنا شروع کر دیا رک رک کر:

”صاب جی اب ہماری برداشت جواب دے گئی ہے۔ یہ ملک حد سے بہت بڑھ گیا ہے۔ میں ملک کا گاؤں چھوڑنا چاہتا ہوں راتوں رات“۔ ”مگر کیوں؟“ میرا یہ پوچھنا تھا کہ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ میں نے پھر اسے حوصلہ دیا اپنا وعدہ دہرایا اور سب کچھ کہہ دینے کو کہا۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی تھیں اور سوچ رہا ہوگا کہ کہاں سے شروع کرے۔ آخر اس نے رک رک بولنا شروع کیا ”صاب جی میرے پاس صرف تین دن ہیں اور دو راتیں اور ابھی یہ بھی نہیں پتہ کہ کہاں جانا ہے۔“ ”مگر کیوں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ جانے میرے لہجے سے اسے کچھ حوصلہ ملا یا ”کہو یا مرو“ اور ”اب یا کبھی نہیں“ والی سٹیج آ گئی تھی، اس نے پھر سے بولنا شروع کیا ”صاب جی میری ایک ہی بہن ہے صغریٰ، سولہ سال کی ہے۔ ملک نے اسے خود دیکھا ہے یا کسی نے بتایا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ پرسوں اس نے مجھے بلایا اور سوتے وقت صغریٰ کو حویلی بھیجنے کا حکم دیا۔ میں سن کر کانپ گیا مگر حوصلہ رکھا۔ پتہ نہیں رب نے مجھے کیسے عقل دی۔ میں نے ملک سے چار دن بعد کا وقت لے لیا یہ بہانہ کر کے کہ اسے کپڑے آئے ہوئے ہیں۔ بیوی کی حد تک تو میں برداشت کرتا رہا ہوں مگر بہن۔۔۔“ بات کر کے وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں سن ہو گیا اور میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ کچھ سوچ کر میں اٹھا اور اسے ساتھ آنے کو کہا۔ ڈرائیور سے جیپ کی چابی لی اور مانک کو ساتھ بٹھا کر گاڑی کو اپنے ایک جاننے والے زمیندار کے ڈیرے کی طرف موڑ دیا۔

اگلی رات پک اپ کے ذریعے مانک کا سامان بمع فیملی کے راجہ نعیم کے ڈیرے پر منتقل ہو چکا تھا۔ نعیم کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا، بھروسہ مند بھی تھا اور لحاظ کرنے والا بھی۔ ویسے بھی مانک جیسے محنتی بندے کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی۔ مانک کو بھی نہ تو چھٹی کی ضرورت پڑی نہ وہ رحیمو کا زیر بار ہوا۔۔۔ یہ بعد میں کھلا کہ رحیمو اس کام کے بدلے صغریٰ کی بانہہ کا وعدہ لے چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

غزل

سب کا ایک مالک تھا، یہ زمین سب کی تھی
یاد ہے خُدا والو، یہ خدا کی بستی تھی

اک عجب حویلی تھی، اَن گنت گھرندوں میں
فاصلوں کے رقبوں پر، دُوریوں میں پھیلی تھی

تیرگی کے دریا پر بند کس نے باندھے تھے
رات کس پہ گزری تھی، صبح کس نے دیکھی تھی

شہر تھا کہ صحرا تھا، شور ایک جیسا تھا
اک طرف صدائیں تھیں، اک طرف خموشی تھی

کِس اَنا کے بندے نے جان وَار دِی خالد
جاہ و زَر پرستی تھی، یا یہ خُود پرستی تھی

خالد احمد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

غزل

قریہ جاں میں اب کیا خوشی کیا غمی، کتنی مشکل ہوئی
کیا کسی سے کہیں ان دنوں زندگی کتنی مشکل ہوئی

جانے کب کوئی ناراض دَم زمزمِ حرف کو سم کرے
اِن عذابوں ڈری رُت کھری شاعری کتنی مشکل ہوئی

اک شگوفے سے کیا کیا فسانوں کے جنگل اگائے گئے
جھوٹ کی بھیڑ میں اصل کی آگہی کتنی مشکل ہوئی

کیسے زعموں کی رَو میں اچھلتے چھلکتے ہوئے ہم گئے
واں پہنچ کر مگر اک نہ اپنی چلی کتنی مشکل ہوئی

اس کو شہرِ خرد کی چکا چوند میں ہم نے ڈھونڈا بہت
اور آخر اک اندھی گلی آ گئی کتنی مشکل ہوئی

دن گزرتے گئے، آس گھٹتی گئی، چاک بڑھتا گیا
کل جو بخیہ گری کتنی آسان تھی، کتنی مشکل ہوئی

اجنبی تھا تو بے تاب دل کو کہیں چین پڑتا نہ تھا
اس سے عالی مگر دوستی اور بھی کتنی مشکل ہوئی

جلیل عالی

غزل

خود سے بچ نکلنے میں عمر بیت جاتی ہے
اس بلا کے ٹلنے میں عمر بیت جاتی ہے

ہر کسی پہ ہوتا ہے انکشاف منزل کا
راستے بدلنے میں عمر بیت جاتی ہے

رات کے اندھیرے سے ڈر رہے ہیں ہم لیکن
اک چراغ جلنے میں عمر بیت جاتی ہے

ایک ایک ٹھوکر پر پاؤں ڈگمگاتے ہیں
پھر ذرا سنبھلنے میں عمر بیت جاتی ہے

اک ذرا سی آہٹ پر، ٹوٹ بھی اگر جائے
خواب سے نکلنے میں عمر بیت جاتی ہے

چند ساعتیں ہیں بس سر اٹھا کے چلنے کی
اور ہاتھ ملنے میں عمر بیت جاتی ہے

لوگ کر تو لیتے ہیں اہتمام شب بھر کا
اور شام ڈھلنے میں عمر بیت جاتی ہے

چاندنی میں دیکھیں گے مرمریں بدن اس کا
چاند کے نکلنے میں عمر بیت جاتی ہے

ہم کنورؔ اگر بوئیں دل میں بیج چاہت کا
پھولنے پھلنے میں عمر بیت جاتی ہے

اعجاز کنور راجہ

غزل

پہلے تیری یاد کے دُکھ
باقی سارے بعد کے دُکھ

شہر کے منظر پر حاوی
اپنے دلِ برباد کے دُکھ

کچھ دُکھ میرے اپنے ہیں
کچھ میرے ہمزاد کے دُکھ

اگلی نسلیں کیوں جھیلیں؟
میرے اور اجداد کے دُکھ

مجھ بوڑھے کو مت دیجو
اے مالک! اولاد کے دُکھ

دل میں بسائے ہیں ہم نے
قریۂ بے آباد کے دُکھ

فرد اُٹھائے پھرتا ہے
کتنے ہی افراد کے دُکھ !

کیسے ہو سکتے ہیں نسیمؔ؟
صَید کے دُکھ صیّاد کے دُکھ!

نسیمِ سحر

غزل

تیری آنکھوں میں اداسی کا اثر باقی ہے
اس کا مطلب ہے ابھی اور سفر باقی ہے

کم نہیں یہ بھی کہ اس قریۂ نا پُرساں میں
تجھ سے کچھ رابطۂ خیر و خبر باقی ہے

اور مل جائے گی دستارِ تاسف کیسا
شکر اس بات پہ لازم ہے کہ سر باقی ہے

منتظر خواب ہیں تعبیر میں ڈھلنے کے لیے
ہو نہ غافل کہ بہت کارِ ہُنر باقی ہے

چہچہائیں گے پرندے بھی ہری شاخوں پر
لوٹ سکتی ہیں بہاریں کہ شجر باقی ہے

ہم نے کیا کیا تری خاطر سُخن آرائی کی
روح میں حسرتِ اظہار مگر باقی ہے

چلنے والوں کے لیے ہیں کئی امکاں موجود
قافلے ختم نہیں راہ گزر باقی ہے

روشنی ختم نہ ہو گی کبھی جب تک گلزار
دہر میں سلسلۂ شمس و قمر باقی ہے

گلزار بخاری

غزل

بے مقصد بے کار ہے دنیا
اِک ردی اخبار ہے دنیا

خود ہی مجرم خود ہی منصف
خود ہی تھانے دار ہے دنیا

ایک سے بڑھ کر ایک ملے گا
خوابوں کا بازار ہے دنیا

اِس کے پار نہ جانے کیا ہو
رستے کی دیوار ہے دنیا

باہر کی سج دھج پر مت جا
اندر سے بیمار ہے دنیا

کاروبار میں دو نمبر کے
اک نمبر فنکار ہے دنیا

جتنا کھوج سکو تم پر ہے
سر بستہ اسرار ہے دنیا

کچھ کے لیے فرشِ مخمل اور
کچھ کے لیے پُر خار ہے دنیا

جس کی آنکھ لگی نہیں جاگا
بھیڑیوں کا اک غار ہے دنیا

خود اندازہ ہو جائے گا
کتنی دنیا دار ہے دنیا

کل کس نے دیکھی ہے راحتؔ
یاد رہے اِک بار ہے دنیا

راحت سرحدی

غزلیں

مدرسے بند ہُوئے، کُھل گئے مے خانے سب
ہوش میں آنے لگے ہیں ترے دیوانے سب

نکل آئی ہے کہانی سے کہانی کوئی اور
رہ گئے دہر میں ہی دہر کے افسانے سب

آنکھ کُھل جائے گی آ جائے گا جب یومِ نشور
یہیں رہ جائیں گے یہ دُنیا کے یارانے سب

مجھ پہ الزام ہے بس ساقی گری کا ورنہ
اپنے ہاتھوں سے ہی دیتا ہے وہ پیمانے سب

ابھی کُھل جائے مرے قتل کی گتھی خاورؔ
لاؤ تو یاروں کے اُترے ہُوئے دستانے سب

خاور اعجاز

ہویدا ہو چکے ہیں شام کے آثار ہر جانب
گلی میں گھومتے پھرتے ہیں پہرے دار ہر جانب

دکانِ دہر میں میرے علاوہ کچھ نہیں لیکن
مرے ہی دَم سے ہے یہ گرمیِ بازار ہر جانب

وہ چلمن اور گھونگھٹ کے زمانے لد گئے کب کے
کہ اَب تو ہے تماشائے لب و رخسار ہر جانب

ہمی محرومِ الطاف و عنایت رہ گئے ورنہ
نظر آتے ہیں تیرے آشنا دو چار ہر جانب

زمانے آتے جاتے ہیں میاں وصل و جدائی کے
کبھی صحرا ہے ہر جانب کبھی گلزار ہر جانب

ہم ایسے مختلف کچھ سوچنے والے کہاں جائیں
غزل میں ہو روایت ہی کی جب تکرار ہر جانب

ہماری خواہشوں نے روک رکھا ہے ہمیں خاورؔ
کھڑی ہیں راستے میں صورتِ دیوار ہر جانب

غزل

خواب پڑے ہیں کونوں میں
ٹوٹے ہوئے کھلونوں میں

گِرے ہوئے ہیں مُدّت سے
ہم قد آور بونوں میں

کس نے آکر سونا ہے
اِتنے صاف بچھونوں میں

اک تھی محبت ، اک دولت
پیار بہت تھا دونوں میں

نیندیں جاگتی رہتی ہیں
شب بھر ٹیلی فونوں میں

آرزوئیں بھی جانِ انیس!
بِک گئیں اونوں پونوں میں

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

جمی ہے آج کل ایسے ہوس کی گرد چہرے پر
نظر آتی نہیں شفقت کسی ہمدرد چہرے پر

کروں بھی عکس بندی گر میں اُن کی، کون دیکھے گا
نشاں ہیں غربت و افلاس کے جو زرد چہرے پر

بہت میں نے چھپائی کیفیت دل کی زمانے سے
مگر احوال نے وہ لکھ دیا خود درد چہرے پر

چھپائے خود کو رکھنا تم، حیا کا یہ تقاضا ہے
نگاہیں نیک و بد پڑتی ہیں سب بے پرد چہرے پر

فقط الفاظ کی صورت محبت رہ گئی اب تو
وفا کیسے تلاشو گے کسی بے درد چہرے پر

حقیقت کھو گئی خوابوں کی دنیا میں، کہاں جائیں
سجاتا ہے نیا چہرہ ، یہاں ہر فرد چہرے پر

کسی احساس نے شاید جگایا اُس کی غیرت کو
یہ شبنم سی اُبھر آئی جو اُس کے سَرد چہرے پر

اسے مردانگی اقبال کہتے ہیں جہاں والے
مسلط خوف جو کرتے نہیں ہیں مرد چہرے پر

اقبال سروبہ

غزلیں

صبر جن کا شیوہ ہے حوصلے سے جیتے ہیں
سوزنِ تبسم سے دل کے زخم سیتے ہیں

مر کے بھی شہیدوں کو موت آ نہیں سکتی
زندگی جو ہارے ہیں، اصل میں وہ جیتے ہیں

اَمن کے علم داروں کو نظر نہیں آئے
قلبِ قومِ مسلم پر حادثے جو بیتے ہیں

اُف یہ مکر و عیّاری، اُف یہ خُوئے خوں خواری
یہ گروہِ انساں ہے یا مُہیب چیتے ہیں

سید قاسم جلال

جب شعورِ منزل و عرفانِ جادہ ہو گیا
سوچ پختہ ہو گئی، مُحکم ارادہ ہو گیا

ذات اپنی معنویت سے ہوئی جب آشنا
زیست کا اُسلوب بے حد سہل و سادہ ہو گیا

کس طرح تخریب کا خوگر ہوا معمارِ قوم
کس طرح شب آفریں، خورشید زادہ ہو گیا

عفوِ عامِ فتحِ مکّہ کا پڑھا جب واقعہ
فکر کو وسعت ملی اور دل کشادہ ہو گیا

عصرِ نو نے جب دیا روشن خیالی کا فریب
پردہ داری کا مبلّغ بے لبادہ ہو گیا

حُبِّ مال و دولت میں مبتلا نہیں ہوتے
جو نبیؐ کے پیارے ہیں، رب کے جو چہیتے ہیں

اے جلال دُنیا میں، ہم ہیں اہلِ دل ایسے
شہد جو پلاتے ہیں اور زہر پیتے ہیں

لوگ سُکھ کی میں جب پھرے دیوانہ وار
اور بھی غم کا اثر دل پر زیادہ ہو گیا

وہ سدا فائز رہے گا منصبِ اُستاد پر
جس سے تھوڑا سا بھی علمی استفادہ ہو گیا

میں فریبِ شہسواری میں نہیں آیا جلال
زندگانی کا سفر طے پا پیادہ ہو گیا

غزل

اجمل اعجاز

بن پیے جب سرور پاتے ہیں
مے کدے کیوں حضور جاتے ہیں

یوں جو نکلیں گے آپ بَن ٹھن کے
حادثے تو ظہور پاتے ہیں

عدلیہ ہو گئی ہے اب آزاد
جیل میں بے قصور جاتے ہیں

عکس اَصلی نہیں دکھاتا اب
آئنے کا فتور پاتے ہیں

جس تماشے میں جاں کا خطرہ ہو
دیکھنے ہم ضرور جاتے ہیں

بے ارادہ ہی اُٹھ گئی تھی نظر
خود کو ہم بے قصور پاتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون اُٹھائے گا ترے بعد تھکن کی گٹھڑی
رُک کے چُن لیں مجھے رہگیر، یہ تقدیر کہاں

غزل

تیرے پاس آنے میں دیر ہو گئی مجھ کو
جوئے شیر لانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

وہ ہدف پہ تھا میرے، تنگ بھی تھے سب گھیرے
تیر ہی چلانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

دیر سے خیال آیا گو میں سب کو ٹال آیا
راز دل بتانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

کس طرح شفا دیتا چارہ گر دوا دیتا
زخمِ دل دکھانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

ہے ادھورا افسانہ اس کو اس میں تھا آنا
اس کے تانے بانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

وہ جلیلؔ آیا بھی رتجگا سجایا بھی
حال دل سنانے میں دیر ہو گئی مجھ کو

احمد جلیل

غزلیں

مل جائے اگر باغ سے مہکار مرے یار !
لے آؤں ترے واسطے اِک ہار مرے یار !

کِھلتا ہی نہیں پھول سرِ شاخِ تمنا
ملتا ہی نہیں دل سے بھی دلدار مرے یار !

ہر موڑ پہ رہتی ہے مرے ساتھ کہانی
بھولا ہی نہیں کوئی بھی کردار مرے یار !

میں اس کے کبھی ناز اُٹھاتا ہی نہیں ہوں
یہ دُنیا نہیں میری طرف دار مرے یار !

یہ دل کہ اِسے ایک ہی حالت کا نشہ ہے
رہتا ہے سدا تیرا طلب گار مرے یار !

پھر شوق سے جس سمت بھی جائے وہ ستمگر
آ جائے مگر سامنے اِک بار مرے یار !

اُس سے مانگی نہیں مہلت کسی غم خواری کی
رُو بہ رُو کر دیا انکار مرے یار !

نثار ترابی

کس سے ملائیں ہات مرے کیا کریں !
ہر سُو ہے ایک گھات مرے یار کیا کریں !

خواب سحر میں ایسا فسوں تھا چھپا ہُوا
جاتی ہی نہیں رات مرے یار کیا کریں !

وہ جس سے ایک پل کی بھی دوری محال ہے
اُس سے نہ ہوگی بات مرے یار کیا کریں !

دنیائے ہست و بود میں آ کر کُھلا ہے یہ
تنہا ہے اپنی ذات مرے یار کیا کریں !

ہے شاخ شاخ لرزاں، شجر ہیں دُکھے دُکھے
بجھنے لگے ہیں پات مرے یار کیا کریں !

پھر موجِ غم کی زد میں ہیں انساں کی گردشیں
پھر چشمِ نم ہے سات مرے یار کیا کریں !

دن کا پہاڑ سر تو کیا ہے مگر بتا
سر پر پڑی ہے رات مرے یار کیا کریں !

غزل

جس نے لکھی ہیں مرے نام خطائیں ساری
اے خدا! دے دے مجھے اُس کی بلائیں ساری

اپنے وعدے ، وہ ارادے سبھی واپس لے لو
اور لوٹا دو مجھے میری صدائیں ساری

کارِ تقسیمِ محبت مجھے تفویض کیا
میرے حصے میں لکھیں جب کہ جفائیں ساری

جانے کس سمت میں کُھلتا ہے کوئی بابِ قبول
جانے کس عرش پہ ٹھہری ہیں دعائیں ساری

غم چراغوں کا نہیں بلکہ تسلی یوں ہے
متفق ہو تو گئیں آج ہوائیں ساری

مذہبِ عشق میں لازم تھا لہٰذا میں نے
زانوئے عشق پہ رکھی ہیں انائیں ساری

ایک حسرت ہی رہی ، ایک تمنا ہی رہی
رکھ کے سر کاندھے پہ روداد سنائیں ساری

سوچ لو جتنی تکالیف دیے جاتے ہو
آئینہ بن کے جو اک روز یہ آئیں ساری

اب کوئی معجزہ ہی بات بنا سکتا ہے
بے اثر اپنی دعائیں ہیں ، دوائیں ساری

خالدہ انور

غزل [آصف شفیع کے نام]

میرے اندر کوئی خلا بھی ہے
دل دھڑکنے کی پر صدا بھی ہے

سارے مل کر مرے خلاف ہوئے
مختلف ہونا اک خطا بھی ہے

اس میں حیرت کی بات کون سی ہے
جب دیا ہے تو پھر ہوا بھی ہے

کیسا اعجاز ہے یہ قدرت کا
آگ راحت بھی ہے سزا بھی ہے

دل کی دھڑکن بنا ہوا ہے وہ
اور رسائی سے ماورا بھی ہے

اس تعلق کو نام کیا دوں میں
جس تعلق سے وہ خفا بھی ہے

ایک بندہ ہے یار دیکھو تو
ایک ہی وقت میں خدا بھی ہے

سامنے آئنے کے رہتا ہے
ایک پتھر کہ بولتا بھی ہے

سعد ، اقبال کا تو قائل ہے
میر و غالب کو مانتا بھی ہے

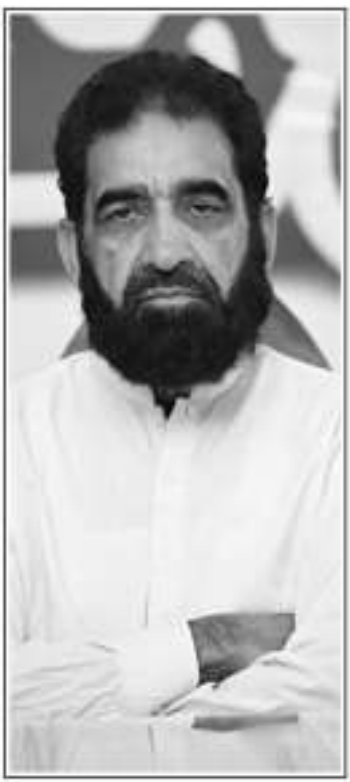

سعد اللہ شاہ

غزل

ہر دل ہے بیقرار یکم جنوری کے بعد
آنکھیں ہیں اشکبار یکم جنوری کے بعد

وعدہ کیا ہے اس نے گزاریں گے ایک ساتھ
دن زندگی کے چار، یکم جنوری کے بعد

لفظوں میں ہے گلاب کی خوشبو رچی ہوئی
شعروں پہ ہے بہار، یکم جنوری کے بعد

اَب وینٹی لیٹروں پہ ہے سچائی کا وجود
جھوٹے ہیں باوقار، یکم جنوری کے بعد

کیوں لگ رہا ہے مجھکو کہ سورج کے گرد بھی
ہے دُھند کا حصار، یکم جنوری کے بعد

تو حادثوں کے جال سے بچ کر نکل گیا
صدقہ تو اب اُتار، یکم جنوری کے بعد

پھر شہر شہر ہو گا نئی پتلیوں کا ناچ
جب بدلا اقتدار، یکم جنوری کے بعد

سَب درد و غم سمیٹ کے دیکھو پروئے ہیں
میں نے غموں کے ہار، یکم جنوری کے بعد

ہر ایک یاد آتی رہی میرے سامنے
باندھے ہوئے قطار، یکم جنوری کے بعد

کمرے میں اَب پُرانے کلینڈر کا کام کیا
اَب تو اسے اُتار، یکم جنوری کے بعد

اِس بات کی عقیل ہمیں کچھ خبر نہیں
بچھڑیں گے کتنے یار، یکم جنوری کے بعد

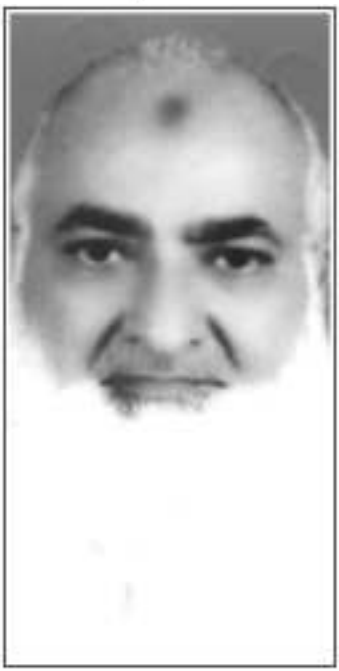

عقیل رحمانی

غزلیں

اپنا افسوس کر نہیں سکتے
ہم تسلی سے مر نہیں سکتے

لوگ دن رات کی مشقت سے
پیٹ اِک وقت بھر نہیں سکتے

کچھ خبر ہے ہمارے بارے میں
مر تو سکتے ہیں ڈر نہیں سکتے

آسمانوں کو تو سہولت ہے
وہ زمیں پر اتر نہیں سکتے

زخم ہیں زخم بھی محبت کے
یہ کسی طور بھر نہیں سکتے

آپ دل میں اتر تو سکتے ہیں
دل سے لیکن اتر نہیں سکتے

سب معین ہے اِس معین کو
کر ادھر سے ادھر نہیں سکتے

خط نہ آنے کا مدعا صاحب
ڈاکیے پر تو دھر نہیں سکتے

مسعود احمد

دل مٹھی میں ہاتھوں میں کرپانیں ہیں
کیا ونجھلی ہے کیا ونجھلی کی تانیں ہیں

ساتھ ہمارا میمنہ میسرہ دشمن کے
اور ہماری گردن کی گردانیں ہیں

بیش بہا موقع سرمایہ کاری کا
یار ہمارے دل سونے کی کانیں ہیں

اس صحرا کی پشت پہ ایک سمندر تھا
اس میدان سے آگے کئی چٹانیں ہیں

سب کا سب معلوم پرانے گاہک کو
اس بازار میں کتنی نئی دکانیں ہیں

دل نے سیکھی صرف زبان محبت کی
اس دنیا میں کتنی اور زبانیں ہیں

مرجاتے ہیں سو سو، ایک دھماکے میں
ہم جیسوں کی کتنی سستی جانیں ہیں

خون ہمارا مفت میں کھولتا رہتا ہے
تنگ پڑی کیوں دل کی یہ شریانیں ہیں

میلہ ہے اِک سازوں کا آوازوں کا
موسیقار کے اندر سر اور تانیں ہیں

رحم خدایا رحم ہماری حالت پر
وقت بے وقت یہ صبح و شام اذانیں ہیں

غزل

کتنی پر لطف یہ زندگی ہو گئی
جب غموں سے مری دوستی ہو گئی

میں نہ بہروپ چہرے سمجھ پائی جب
میری دشمن ، مری سادگی ہو گئی

وہ تو ہر جائی ہے، اس سے کیسا گلہ
مشغلہ اس کا یہ دل لگی ہو گئی

ان کی بدلی ہوئی ہر روش دیکھ کر
جیسے عنقا ہی اب تو خوشی ہو گئی

گوشہء عافیت مجھ کو بہتر لگا
ان کی الفت میں جب سے کمی ہو گئی

ہر تعلق کی بنیاد مطلب پہ ہے
دنیا میرے لیے اجنبی ہو گئی

دل نے افروز پایا ہے بے حد سکوں
گفتگو جب سے یہ خامشی ہو گئی

افروز رضوی

غزل

مجھ سے گھر آ کے ملا ہے کوئی
راستہ بھول گیا ہے کوئی

تجھ سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا
اپنے دل میں بھی بسا ہے کوئی

شاید اس شہر میں جی لگ جائے
بس یہی سوچ چلا ہے کوئی

مجھ سے چاہے وہ پرستش اپنی
جس طرح میرا خدا ہے کوئی

میرے کم ملنے کی عادت پہ امام
مجھ سے ناراض ہوا ہے کوئی

مظہر امام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

غزلیں

زندگی کیوں کر سزا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے
دردِ دل کی کیا دوا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

کوچ کرتے جا رہے ہیں لوگ اپنے شہر سے
کیوں رواں یہ قافلہ ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

انتہا کوئی نہیں ہے آپ کے جب حسن کی
عشق کی کیا انتہا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

لشکرِ اعدا میں شامل، ہیں اگر لاکھوں نفوس
خوف کیا دل کو بھلا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

زندگی بخشے دلوں کو آپ کا حسنِ کلام
خلق کیوں مرگ آشنا ہو آپ کے ہوتے ہوئے

آپ کے دم سے ہے قائم، سلسلہ ہائے وفا
اور پھر قحطِ وفا ہو، آپ کے ہوتے ہوئے

آپ کے ہوتے ہوئے کیوں کر بچے کوئی ہمیں؟
کیوں کسی پر دل فدا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

آپ آ جائیں تو جم جائے بساطِ دوستاں
رنگِ محفل کیا سے کیا ہو! آپ کے ہوتے ہوئے

آپ سے باتیں کرے شوکت تخیل میں، مگر
لفظ کوئی کیا ادا ہو؟ آپ کے ہوتے ہوئے

شوکت محمود شوکت

دیکھیں اِدھر جو صبح، اُدھر وقت شام ہے
قسمت میں اپنی زندگی تیز گام ہے

وہ موسمِ بہار ہو یا ہو خزاں کا دور
دل کے چمن میں ایک گلِ لالہ فام ہے

دنیا میں اور کام بھی ہوں گے، بجا مگر
ہم کو تو بس جہاں میں محبت سے کام ہے

قول و عمل میں شیخ کا دیکھیں ذرا تضاد
لب پر صدائے حق ہے تو ہاتھوں میں جام ہے

چرچے جہاں میں جس کے تھے اونچی اڑان کے
وا حسرتا! عقاب وہی زیرِ دام ہے

غالب نہیں کہ ڈھونڈیے فرصت کے رات دن
شوکت ہیں اور تیغِ عمل بے نیام ہے

غزل

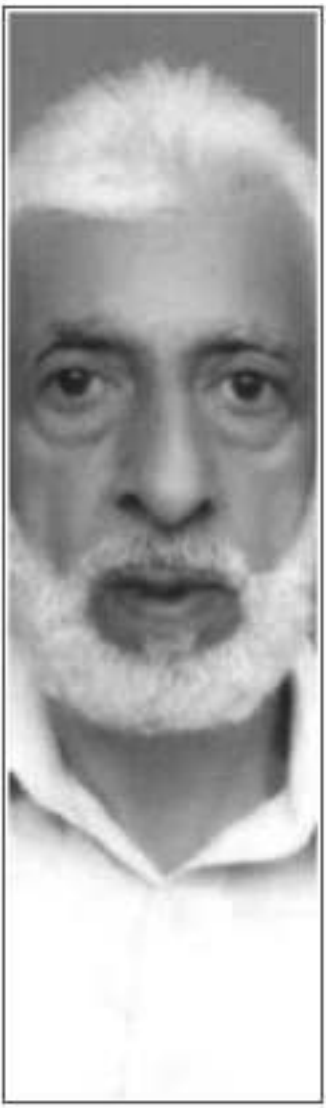

وفا نے رنگ ابھی بدلہ نہیں ہے
مجھے اس شخص نے سمجھا نہیں ہے

یہاں حق ہے امیروں کا زمیں پر
غریبوں کے لیے رقبہ نہیں ہے

مرا گھر تھا گلابوں کے نگر میں
مرے گھر کا تو یہ نقشہ نہیں ہے

تمنا ہے مجھے جس چاند کی بھی
مرے آنگن میں وہ اترا نہیں ہے

میں جھیلوں گا نئے زخموں کو کیسے
پُرانا زخم ابھی اچھا نہیں ہے

کسی نے بے وفا اُس کو کہا تو
یہ دل بولا نہیں ایسا نہیں ہے

جو لے جاتی ہے سچائی کی جانب
کوئی اُس راہ پر چلتا نہیں ہے

ملا دے جو مجھے شاہد مجھی سے
وہ لمحہ آج تک آیا نہیں ہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

چھوڑ کر ہم بھی اپنا گھر آئے
راہ میں جو گھنے شجر آئے

اُس کے کوچے سے ہم گُزر آئے
تنہا تنہا یہاں نظر آئے

دل کی مسند سے ہم اُتر آئے
جو پرانے تھے گھر نکھر آئے

دل کی آہوں میں جب اُتر آئے
ساتھ جو عمر بھر نظر آئے

زیست میں ایسے بھی سفر آئے
شاخ پر جس طرح ثمر آئے

شام گزرے تو پھر سحر آئے
چاہتے تو نہ تھے مگر آئے

شکر ہے آج تم نظر آئے
تیری محفل میں ہم اگر آئے

خود کو لوگوں سے منسلک رکھنا
ہاتھ مشکل سے یہ ہنر آئے

خود کو ہم ڈھونڈتے رہے طاہر
کرکے ہجرت نگر نگر آئے

طاہر ناصر علی

غزل

تمہارے کہنے پہ کھیل سارا نہیں چلے گا
کہا نہیں تھا یہ استخارہ نہیں چلے گا

میں آم کے پیڑ پھر لگا دوں گا لیکن ان پر
کوئی ضمانت تو دے کہ آرا نہیں چلے گا

اگر ہیں کچھ دن تو کٹ ہی جائیں گے جیسے تیسے
مگر ہمیشہ تو یوں گزارہ نہیں چلے گا

یہ جن کو کھل کھیلنے کی ترغیب دے رہے ہو
پھر ان پہ بھی کل کو بس ہمارا نہیں چلے گا

بہا کے لے جائے گا یہ بستی بھی ساتھ اپنے
بہاؤ بڑھنے پہ یہ کنارہ نہیں چلے گا

ہے کام آتا کبھی تو تنکے کا بھی سہارا
یہی سہارا مگر دوبارہ نہیں چلے گا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک خالد کوئی بہائے نیر

غزل

کیا پوچھنے والو پوچھتے ہو ، احوال ہمارے جانی کا
چوپال سجائے رکھتا ہے ، شوقین ہے قصہ خوانی کا

افسوس مرے کرداروں میں ، اک بھی ایسا کردار نہیں
بن جائے جو آسانی سے ، زندہ کردار کہانی کا

وہ اور تھے جن کی قسمت میں ، سامان تھے عیش و عشرت کے
ہم نے تو یار گذار دیا ، رو رو کے دور جوانی کا

احسان ترا ہو جائے گا ، دو گھونٹ عنایت کرنے سے
میں تشنہ کام ہوں صدیوں کا ، تُو چشمہ میٹھے پانی کا

آ جاؤ باز حسینوں سے ، ہو جاؤ دور کمینوں سے
اِس عمر میں یارو کرتے ہو تم دھندہ یہ نادانی کا

یہ بستی سے منہ موڑ چکا ، اپنوں سے ناتا توڑ چکا
بے فکر ہے دین و دنیا سے ، گھر بار نہیں سیلانی کا

دکھ درد زمانے کے انصر ، اعصاب سے جھڑنے لگتے ہیں
جب شام ڈھلے میں لیتا ہوں ، اک بُوسا اُس پیشانی کا

انصر حسن

غزل

آپ سے باخدا محبت ہے
اور بے ساختہ محبت ہے

اب مجھے دیکھنا سکھا دیجے
اب مرا آئنہ محبت ہے

میرا پہلا سخن تمھارا نام
میری پہلی دعا محبت ہے

تتلیوں کو بلا کے لے آؤ
پھول کا مسئلہ محبت ہے

کوئی تہمت نہ داغِ رسوائی
یہ محبت بھی کیا محبت ہے

سب سے اپنا جدا قبیلہ ہے
سب سے اپنی جدا محبت ہے

خاک کی ابتدا نہیں معلوم
خاک کی انتہا محبت ہے

افتخار شوکت

غزل

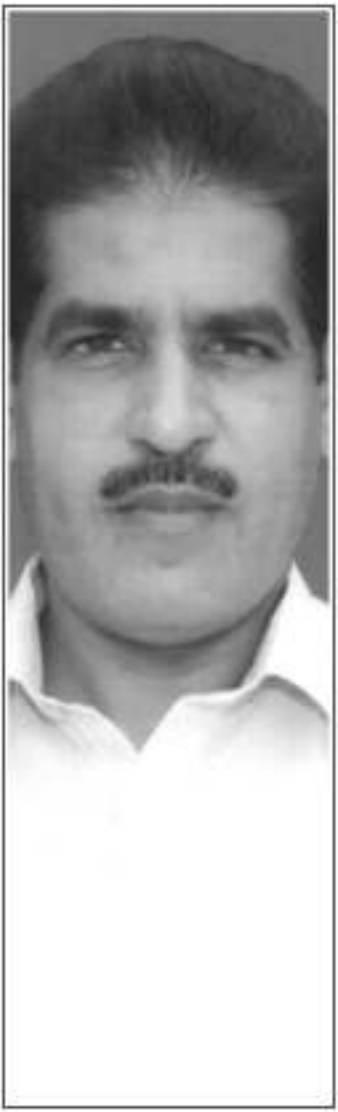

ہر تمنا اپنے سینے میں دبانا پڑ گئی
اپنی میت اپنے شانوں پر اٹھانا پڑ گئی

بارور ٹھہری نہیں محنت بزرگوں کی تمام
پھر نئی کھیتی محبت کی اگانا پڑ گئی

چھوٹے بچوں کی لڑائی میں اضافہ دیکھ کر
بھائیوں کو صحن میں دیوار اٹھانا پڑ گئی

دیکھ کر اس کو ہجومِ شہر سے ملتے ہوئے
بے بسی اپنی زمانے سے چھپانا پڑ گئی

رشتہ داری کیا بنی کم ظرف لوگوں سے مری
خرچ گھر سے دے کے ہی بیٹی بسانا پڑ گئی

تیری خاطر کتنے لوگوں سے بڑھا کر رابطے
اک نئی بستی مراسم کی بسانا پڑ گئی

کیا کسی سے ٹھیس پہنچی ہے تجھے اس شہر میں
میری جانب جو نظر پھر سے اٹھانا پڑ گئی

سرور فرحان

غزل

گر سب اچھا ہونا ہوتا تو سب اچھا ہو سکتا تھا
جس نے بگڑنا تھا وہ بگڑا وہ کب اچھا ہو سکتا تھا

چارہ گروں کی چارہ گری نے آخر اس کو مار دیا
جس نے اچھا ہو جانا تھا وہ جب اچھا ہو سکتا تھا

نظم جہاں پر سوچنے والے جانے کب سے سوچ رہے تھے
لگتا نہیں تھا کارِ جہاں بھی اتنا بے ڈھب ہو سکتا تھا

وقت کی نبض پہ ہاتھ جو ہوتا تو حالات بدل سکتے تھے
یہ اس وقت کی بات تھی لیکن یہ تو بس تب ہو سکتا تھا

توبہ کی جو مہلت ملتی تو توبہ بھی ہو سکتی تھی
وقت پہ توبہ جو کر لیتے تو راضی رب ہو سکتا تھا

جانے کیسے آتے جاتے، آمنا سامنا ہو جاتا تھا
اتنی گہری چاہت کا یہ ایک سبب ہو سکتا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزلیں

میلا تیرے دل کا درپن ہو سکتا ہے
سونا سونا میرا آنگن ہو سکتا ہے

یوں محسوس مجھے ہوتا ہے ، مجھ کو حاصل
اک نہ اک دن تیرا کنگن ہو سکتا ہے

وقتِ آخر یہ مجھ کو معلوم نہ تھا
اتنا نازک اُس کا بندھن ہو سکتا ہے

اب کے یار ندیم ذرا محتاط ہی رہنا
دوست جسے کہتے ہو دشمن ہو سکتا ہے

کس کو علم تھا ملک میں اتنا خون بہے گا
مقتل کی صورت یہ گلشن ہو سکتا ہے

ریاض ندیم نیازی

صحنِ افلاس میں جو پلے کے بڑے ہوتے ہیں
صبر اور ضبط کے ہیروں سے جڑے ہوتے ہیں

منزلیں دور سے کرتی ہیں اِشارے اُن کو
عزمِ نو لے کے جو راہوں میں کھڑے ہوتے ہیں

زندگانی کے کسی موڑ پہ مل جاتے ہیں
عہدِ ماضی میں جو احباب لڑے ہوتے ہیں

ان میں منصور بھی کچھ ہوتے ہیں سقراط بھی کچھ
یہ جو کچھ لوگ سرِ راہ پڑے ہوتے ہیں

مستقل سوچ کہاں ہوتی ہے ہر اک کی ندیم
ہاں مگر بات پہ جو اپنی اَڑے ہوتے ہیں

غزل

مرے آنسوؤں سے ابھری یہ صدائے آرزو ہے
نہ ہی ضبطِ غم ہے دل کو نہ ہی پاس میرے تو ہے

کوئی گمشدہ مسافر جسے کارواں سے بچھڑے
بڑی دیر ہو گئی ہے مجھے اس کی جستجو ہے

کسی شاخِ غم سے لپٹی جو چلی صبا چمن سے
ہے اسی کی سب کرامت یہ جو سانس مشکبو ہے

سرِ شام ہی سے روشن جو ہوا چراغ دل میں
کوئی درد ہے پرانا کہ خیالِ یار تو ہے

وہی شبنمی سی آہٹ جو نصیب جاں ہوئی تھی
مرے اشک کہہ رہے ہیں یہ اسی کی گفتگو ہے

جو بکھر گیا فضا میں جو مہک اٹھا صبا سے
جو سمٹ گیا حیا سے وہی عکس ہوبہو ہے

مرے پاس بیٹھے رہنا مجھے ساتھ لے کے اُٹھنا
مرا ہاتھ تھامے رکھنا یہ سوالِ آبرو ہے

اویس الحسن

غزلیں

سُن تعلق ہے جس قبیل کے ساتھ
بات کرتا ہے وہ دلیل کے ساتھ

اک زمانے کو اب ہرانا ہے
آ کے بیٹھا ہوں سنگِ میل کے ساتھ

یہ سرِ عام فاختہ نے کہا
میں نے اُڑنا نہیں ہے چیل کے ساتھ

اپنی منزل وہ پائے گا اک دن
جو بھی چلتا رہے گا نیل کے ساتھ

جو محبت کی یادگار بنے
گھر بناؤں گا ایک جھیل کے ساتھ

مجھ کو عابد نہ بھول پائے گا
وقت کاٹا جو اک ذلیل کے ساتھ

عابد معروف مغل

وقت ہی وہ منصف ہے جس نے یہ بتانا ہے
کس کی جیت ہونی ہے کس نے ہار جانا ہے

دل کی بات مانی تھی عشق جب کیا تجھ سے
دل سے پوچھ لیتا ہوں کس طرح بھلانا ہے

ایک ہی تو نیکی ہے جو ہمیشہ کرتا ہوں
یہ مرا وطیرہ ہے ہر گرا اُٹھانا ہے

آج تک نظر میری تک رہی ہے رہ تیری
منتظر ہوں میں تیرا کب پلٹ کے آنا ہے

پوچھنا ضروری ہے سر پھری ہواؤں سے
راہ کے چراغوں کو تم نے کیوں بجھانا ہے

آج پھر سجائی ہے بزم اپنے یاروں نے
آج کیا؟ کسی نے پھر کچھ نیا سنانا ہے

بات مان لے اس کی ضد یہاں نہیں اچھی
روٹھنا ہے تُو نے گر ہم نے بھی منانا ہے

غزل

یہ کیسا حشر بپا ہے غزہ کی پٹی پر
خموش ہو گئے طائر بھی راگنی چپ ہے

محبتوں کی کہانی عجب کہانی ہے
رقیب شور مچاتا ہے، دل بری چپ ہے

ہوس کی چال سے لپٹے ہوئے ہیں وحشی خیال
دوپٹے خوف سے روتے ہیں، کامنی چپ ہے

جہان بھر میں ہے ابہام، شرح بات نہیں
کہ شعر شور مچاتا ہے، شاعری چپ ہے

ہوائیں حبس کے موسم میں منہ چھپائے پھریں
لباس قید میں بیٹھا ہے، دامنی چپ ہے

فرخندہ شمیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لوگ دیوانے ہوئے یا شہر ویرانے ہوئے
کُو بکُو یُوں دامنِ صد چاک لہراتے نہ تھے

غزل

ایسے لگتا ہوں گلے اب کسی دیوار کے ساتھ
جیسے ملتا ہے عزادار ، عزادار کے ساتھ

کسی مذہب کسی مسلک میں کہاں لکھا ہے
پارسا کرتے رہے ہیں جو گنہگار کے ساتھ

میرے منصف ہو تری خیر ہمیشہ تو نے
کیا ہی انصاف کیا درہم و دینار کے ساتھ

ہر ملاقات پہ یوں عشوہ گری ، بے نظری
ایسے کرتا ہے کوئی اپنے پرستار کے ساتھ

زندگی اس کے لئے کارِ اذیت ہے صغیر
جو بھی زندہ ہے یہاں دیدۂ بیدار کے ساتھ

صغیر احمد صغیر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

غزل

آ کر وہ جونہی مجھ سے ہم آمیز ہوئی ہے
دھڑکن بھی مرے دل کی ذرا تیز ہوئی ہے

دیتی ہیں بہت لُطف مجھے زلف کی شامیں
اِن ہی سے زمیں عِشق کی زرخیز ہوئی ہے

بیٹھے ہی رہو پاس مرے شام ڈھلے تک
آنکھوں کی پیالی کہاں لبریز ہوئی ہے

سانسوں میں اُترنے لگی مانوس مہک سی
گُل رنگ تھی پہلے جو، وہ گُل ریز ہوئی ہے

ہوتے ہیں ہر اِک عشق میں کچھ ہجرِ مُسلسل
یوں اپنی کہانی بھی جنوں خیز ہوئی ہے

لِکھی ہے شکست اُس کے مُقدر میں یقیناً
وہ قوم اگر ہمدمِ پرویز ہوئی ہے

آفتاب خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پالنوں کی عُمروں سے اب ہمیں نکلنے دے
خاک میں لتھڑنے دے پاؤں پاؤں چلنے دے

غزل

کوئی آواز نہ آہٹ ہی سُنی تیرے بعد
ایسی سنسان ہوئی دِل کی گلی تیرے بعد

دل میں کچھ اور تمنا نے پنپنے نہ دیا
تیرے آنے ہی کی امید رہی تیرے بعد

روشنی دن کی چبھی آنکھ میں نیزے کی طرح
رات خنجر کی طرح دل پہ لگی تیرے بعد

لے اُڑی یاد کے پتے بھی درختِ دل سے
وقت کی تیز ہوا، ایسے چلی تیرے بعد

میں کسی اور کی باتوں میں بھلا کیا آتا
میں نے اپنی بھی کبھی اِک نہ سنی تیرے بعد

ایک بستر کہ ترستا ہے شکن پڑنے کو
ایک دیوار پہ رہتی ہے نمی تیرے بعد

کیا سے کیا میں نے جتن کر کے نہ دیکھے پھر بھی
گھر سے اِک پَل بھی اُداسی نہ ٹلی تیرے بعد

یہ تو اچھا ہی ہُوا سامنا اُس سے نہ ہُوا
کیا بتاتا میں اُسے، کیسے کٹی تیرے بعد

جو مضامین برت جائے گا تو آج آکاش
ان مضامین پہ لکھیں گے کئی تیرے بعد

احمد سبحانی آکاش

غزل

بھیجا ہوا ہے اور نہ بلایا ہوا ہے درد
مہمان بن کے دل میں سمایا ہوا ہے درد

آنکھوں سے اک جھڑی ہے مسلسل لگی ہوئی
لگتا ہے عاشقی کا ستایا ہوا ہے درد

ہم ہیں جزائے تیرہ شبی میں گندھے ہوئے
اپنی رضا سے دل سے لگایا ہوا ہے درد

جیسے ملائے رند خرابات مے سے مے
ہم نے بھی شام غم میں ملایا ہوا ہے درد

جس اشتہائے عشق کو صدیاں گزر گئیں
مشکل سے اس مقام پہ لایا ہوا ہے درد

دن کارہائے مشقِ زمانہ میں کاٹ کر
شب کی ریاضتوں سے کمایا ہوا ہے درد

پہلے پہل تو درد ورائے گمان تھا
اور اب سرور ضبط کا بھایا ہوا ہے درد

اک فردِ نا شناس کی چاہت میں عابدی
مدت ہوئی کہ دل نے بھلایا ہوا ہے درد

علی حسین عابدی

غزل

درد غیروں کو سنانے تو نہیں ہوتے یار
ہر جگہ اشک بہانے تو نہیں ہوتے یار

دربدر یونہی بھٹکتے ہوئے مرجاتے ہیں
ہم فقیروں کے ٹھکانے تو نہیں ہوتے یار

پھول تربت کے بھلے لاکھ حسیں لگتے ہوں
پر وہ جوڑے میں سجانے تو نہیں ہوتے یار

پاس رکھنا بھی ضروری ہے میاں وعدوں کا
پیار میں روز بہانے تو نہیں ہوتے یار

ہم تو محفل میں تری دید کو آ جاتے ہیں
ہم نے بس شعر سنانے تو نہیں ہوتے یار

جانے کیا سوچ کے دنیا میں ہمیں بھیجتا ہے
جب ہمارے وہ زمانے تو نہیں ہوتے یار

پھینک پانی میں تو نیکی کو کما کر ارشدؔ
ظلم دریا میں بہانے تو نہیں ہوتے یار

ارشد محمود ارشد

غزل

کہیں یہ دل بھی بہلتا ہے ایسی چیزوں سے
کسی کی یاد جُڑی ہے پُرانی چیزوں سے

مرے لیے تو تمہی قیمتی اثاثہ ہو
مجھے غرض ہی نہیں کوئی مہنگی چیزوں سے

یہی تو بات غلط تھی تری جدائی میں
میں گھر بناتا رہا اچھی اچھی چیزوں سے

کمیں سے ہوتی ہے آرائشِ مکاں ورنہ
مکان سجتا نہیں ایسے خالی چیزوں سے

ظہورؔ عمر گزر جاتی ہے سمجھنے میں
کہ ہاتھ کچھ نہیں آتا چمکتی چیزوں سے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تم تو اس سے دور تھے لیکن وہ خود سے دور تھا
تم تو خالد کی طرح خالد سے کتراتے نہ تھے

غزل

ہم اپنی کیفیتِ بد پہ مسکراتے ہوئے
تری گلی سے گزرتے ہیں سر بچاتے ہوئے

نجانے کیوں مجھے ان پر یقیں نہیں آیا
وہ رو پڑے تھے مجھے داستاں سناتے ہوئے

میں اس کے ریشمی احساس کا اسیر بنا
کسی کے جوڑے میں اک پھول کو سجاتے ہوئے

تم اپنے پاس کے منظر پہ استخارہ کرو
صدا نہ دو مجھے اس پار سے بلاتے ہوئے

کسی کی آنکھ کا منظر بدلتا رہتا ہے
کبھی بناتے مجھے اور کبھی مٹاتے ہوئے

طلب کی آخری منزل ہے سامنے عادل
سو چل رہا ہوں زمیں پر قدم جماتے ہوئے

عزیز عادل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

زندگی بھر صرف اسے پوجا مگر گھر بیٹھ کر
پاسدارانِ وفا کا کام دربانی نہیں

غزل

اپنا گھر بار لٹائے ہوئے بھٹکے ہوئے لوگ
کس طرف جائیں گے کچھ بھولے ہوئے لوگ

ایسے گرتے ہیں کہ پھر ہوش نہیں رہتا ہے
اپنے بستر میں شکستہ تھکے ہارے ہوئے لوگ

ہم اکیلے تھے اکیلے ہی رہے بھیڑ میں بھی
شہر میں جتنے بھی تھے سارے تمہارے ہوئے لوگ

روز کرتے تھے کسی ہوش ربا شہر کی سیر
رات کو گاؤں کی چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگ

کس طرح جائیں گے واپس نہیں معلوم کہ اب
اپنے دوزخ میں ہیں جنت سے نکالے ہوئے لوگ

تم بھی کیا ہاتھ کبھی ملتے ہو افسوس کے ساتھ
تم کو بھی یاد کبھی آتے ہیں روٹھے ہوئے لوگ

اب خود ہی اپنا پتا ڈھونڈتے پھرتے ہیں کمال
ہم پرندوں کی طرح ڈار سے بچھڑے ہوئے لوگ

محمد اشرف کمال

غزل

عشق کا فیض عام کس نے کیا
درد کا اہتمام کس نے کیا

میں تو ماندِ صبح تاباں تھا
میری ہستی کو شام کس نے کیا

میرے حصے میں آ گئیں یادیں
گزری باتوں کا نام کس نے کیا

میرے دل میں سما گیا ہے کون
مجھ کو اپنا غلام کس نے کیا

منفرد کیوں نہ قیس ہو محسن
قیس کی طرح کام کس نے کیا

میتھیو محسن

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

دور کچھ بھی نہیں، اے جاں، تری دارائی سے
کبھی درّانہ گزر جا ، مری تنہائی سے

غزل

میں چلا تھا کب کہاں سے اور کہاں تک آ گیا
میں یقین کی سرحدوں سے پھر گماں تک آ گیا

میں اندھیروں میں بھٹکتا ہی رہا تھا رات بھر
اک پرندہ اُڑتے اُڑتے آشیاں تک آ گیا

میری منزل تو زمیں پر ہی کہیں تھی منتظر
میں زمیں پر چلتے چلتے آسماں تک آ گیا

روبرو نہ کہہ سکا تیرے جو کہنا تھا مجھے
تھا مقید دل میں میرے جو زباں تک آ گیا

یہ تو سب تیرا کرم ہے اور ہے تیری عطا
مجھ سا عاصی دیکھیے تیری اماں تک آ گیا

التجا اشفاق کی ہے دربدر نہ کیجیے
چھوڑ کر ہر در میں تیرے آستاں تک آ گیا

محمد اشفاق بیگ

غزل

کفِ خیال سے اڑتے ہوئے غبار کا رنگ
عجیب پھیکا پڑا تجھ پہ اعتبار کا رنگ

خزاں پرست ہواؤں سے دشمنی کر لی
مگر مدد کو نہ آیا گلِ بہار کا رنگ

اسی کو صحبتِ وافر کا عکس کہتے ہیں
ہمارے چہرے پہ چمکا ہمارے یار کا رنگ

ہمارے منہ سے نوالے بھی چھین سکتا ہے
یہ اقتدار کا موسم یہ اختیار کا رنگ

نہیں ہے بس میں ہمارے یہ نظمِ کارِ جہاں
نہیں ہے ہاتھ میں اپنے یہ کاروبار کا رنگ

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ خالد
بے نیاز آسماں کے رنگ میں تھا

غزل

اس سے دل کی کبھی کہی ہی نہیں
جس کو عرفاں کی لت لگی ہی نہیں

اتنی عجلت میں ہو گئے بیزار
بزمِ وحشت ابھی سجی ہی نہیں

وقت کا راگ ہے رواں ہر سُو
لیکن احساسِ نغمگی ہی نہیں

استعارہ ہوں اپنے ہونے کا
مجھ میں حسرت کوئی بچی ہی نہیں

زندگی کا سفر تمام ہوا
ہجر کی رات کٹ سکی ہی نہیں

جان لینے پہ آ گیا ہے مری
آنکھ جس سے ابھی لڑی ہی نہیں

ایسے ماحول میں ہوا ہے جنم
میری جس عہد سے بنی ہی نہیں

جب سے تیری طلب ہے سینے میں
ایسے لگتا ہے کچھ کمی ہی نہیں

ان گنت رتجگے ہیں مستحسن
یہ جو سرخی ہے قدرتی ہی نہیں

مستحسن جامی

غزلیں

اُس کو حوروں کی میں نے جوانی لکھا اور لکھتا بھی کیا
اُس کو چاہت کی سچی کہانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

دور سے دیکھ کر پیاس بڑھتی بھی ہے اور بجھتی بھی ہے
اُس کے ہونٹوں کو زم زم کا پانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

اس سے بڑھ کر تعصب تو مجھ سے بھی ہوتا نہیں، دوستو!
میں نے اُس بادلی کو سیانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

خوش گمانی مری اُس کے بارے تو اتنی تھی ہر گام پر
اُس کے ہر ظلم کو مہربانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

گالیاں بھی اگر اس نے دیں تو مجھے وہ دعائیں لگیں
تلخ لہجے کو بھی خوش بیانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

اُس سے کہنا محبت کو اظہار کی اب ضرورت نہیں
خود کو دیوانہ اُس کو دوانی لکھا اور لکھتا بھی کیا

فخر عباس

بے وفا ہی تو ہے، ویسے اچھا ہے وہ
کچھ برا ہی تو ہے ویسے اچھا ہے وہ

ہر طرف دیکھنے کا ہے چسکا اُسے
دیکھتا ہی تو ہے ویسے اچھا ہے وہ

موسمی کچھ دباؤں میں تھوڑا بہت
ہتلا ہی تو ہے، ویسے اچھا ہے وہ

میں سگِ کوئے جاناں سے خائف نہیں
بھونکتا ہی تو ہے، ویسے اچھا ہے وہ

اپنی بیماریوں کے سبب سے ہوا
چڑچڑا ہی تو ہے ویسے اچھا ہے وہ

بس رقیبوں سے کرتے ہوئے گفتگو
ہنس رہا ہی تو ہے، ویسے اچھا ہے وہ

غزل

وہ نہیں رہتے ہم چوروں کے ملک میں
پارسا رہتے ہیں گوروں کے ملک میں

دیکھ کر بھیڑیے سے عقابوں کا پیار
فاختہ اڑ گئی ، موروں کے ملک میں

یہ نہیں سن سکی بانگِ اقبال بھی
یہ سماعت لے جا صوروں کے ملک میں

جنبشِ خامہ ہی حرفِ تسلیم ہے
کور چشمی ہے یوں کوروں کے ملک میں

بے حسی نے جنم دے دیئے مسخرے
بُغض ہے پیٹ سے شوروں کے ملک میں

یہ سجا دے کسی ملکہ کے تاج میں
مت ٹنکیں بیچ بے پوروں کے ملک میں

کچھ کھلا کر بہت سارا کھا لیجیے
رسم ہے ، فائدہ خوروں کے ملک میں

دشتِ تاریک میں لگتا ہے جگنو نما
ایک مضبوط ، کمزوروں کے مُلک میں

مڑ کے ساگر کبھی دیکھتے ہی نہیں
جاتے ہیں لوگ جو اوروں کے ملک میں

ساگر حضور پوری

غزل

اُس کے غم پیشِ نظر ہیں رات دن
کیا بتائیں ہم کدھر ہیں رات دن

خواب کی تعبیر بھی اک خواب ہے
اِس لیے بھی دربدر ہیں رات دن

کٹ رہی ہے زندگی اک یاد میں
اب دعائیں پُراثر ہیں رات دن

خود فریبی میں ہوئے ہیں مبتلا
خود سے اِتنے بے خبر ہیں رات دن

ہم حقیقت آشنا ہیں، اِس لیے
خواب کے زیرِ اثر ہیں رات دن

آہ بھرنے میں گذر جائیں گے ہم
یار ! کتنے مختصر ہیں رات دن

عاصم اعجاز

غزل

جانے والے نے بھی سمجھی نہیں منشا میری
اور یونہی عمر گزر جائے گی تنہا میری

ڈوبنے دیتا نہیں ماں کا مجھے دستِ دعا
ورنہ سنتا ہے کہاں موج میں دریا میری

کر سکے بال بھی بیکا نہ مرا نفرت سے
جو محبت سے بدل سکتے تھے دنیا میری

عافیت سمجھی ہے خاموش گزر آنے میں
کون اس شور میں سرگوشیاں سنتا میری

سب ہمیشہ سے جنہیں عیب سمجھتے آئے
آپ گنوانے لگے خوبیاں کیا کیا میری

اختیار اور ہی انداز کیا ہے جاذبؔ
زندگی کرتی ہے کچھ اور تقاضا میری

اکرم جاذب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

تم کو دکھائی دیتا ہے اک پیڑ کٹ گیا
ورثے کا گھر مگر کئی حصوں میں بٹ گیا

کل شب کسی کی یاد میں رویا میں اِس قدر
پھر مجھ سے کوئی خواب میں آ کر لپٹ گیا

اُس خوش بدن کو جاتا ہوا دیکھنے کے بعد
سارے جہاں کا دکھ مرے دل میں سمٹ گیا

چاہا تھا اُس کی یاد کو دل سے نکال دوں
لیکن مرے خلاف مرا دل ہی ڈٹ گیا

لرزے ہیں گھر کے سامنے میرے نحیف ہاتھ
ہائے یہ کس مقام پہ کاسہ اُلٹ گیا

اک دوسرے کی موت پہ ہونا تھا فیصلہ
دکھ سوچ کر یتیمی کے میں پیچھے ہٹ گیا

بے حس بنا رہی تھیں مجھے غم کی شدّتیں
ماں کو سنایا غم تو مرا بوجھ گھٹ گیا

اکمل مری وفات پہ آنسو بہاؤ مت
اپنے خدا کے پاس ہوں واپس پلٹ گیا

اکمل حنیف

غزلیں

اک مسافر ہوں ترے شہر میں بھولا بھٹکا
رہنمائی مری کرنے میں ستارہ بھٹکا

کب تھا اظہارِ محبت کا ارادہ، لیکن
تو نے جب آنکھ ملائی تو ارادہ بھٹکا

ہم گئے گزرے زمانے سے چلے آتے ہیں
بے سبب کہتے پھریں اب کہ زمانہ بھٹکا

یوں اچانک سے ہوئے سینہ بہ سینہ باہم
چند لمحوں کے لیے جسم ہمارا بھٹکا

مجھ پہ ہنستے ہیں مرے حال کی بابت، اے دوست!
لوگ کہتے ہیں ترے شہر کے بہکا، بھٹکا

آئنہ الجھا ہوا دیکھ رہا ہے شاہد
ہم ہیں بھٹکے ہوئے یا عکس ہمارا بھٹکا

شاہد فرید

اک حسیں خواب کی طرح ہے تو
دُرِ نایاب کی طرح ہے تو

جس پہ ٹھہریں محبتوں کے پرند
ایسے تالاب کی طرح ہے تو

چاندنی سی بکھیر دے ہر سو
ایک مہتاب کی طرح ہے تو

چھیڑ دیتی ہے دل کے تاروں کو
مہرِ مضراب کی طرح ہے تو

لب بہ لب چاہتیں مری شاہد
جامِ مے ناب کی طرح ہے تو

غزل

اِس دل میں مچلنے کا ارادہ تو نہیں تھا
یوں عشق میں جلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

جگنو کے تعاقب میں چلے آئے ہیں باہر
جنگل سے نکلنے کا اردہ تو نہیں تھا

سوچا بھی نہیں تھا کبھی جذبات مریں گے
یوں برف میں ڈھلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

بے ساختہ اشعار میں سچ ڈھل گیا ورنہ
یہ آگ اُگلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

سینے کی گھٹن کھینچ کے لے آئی گلی میں
یوں گھر سے نکلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

اشکوں کو چھپانے کے لیے بھیگ رہے ہیں
بارش میں ٹہلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

غم گھیر کے لائے تھے ہمیں شہرِ سخن میں
لفظوں سے بہلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

آصف یہ رویوں کا ہی اک ردِعمل ہے
یہ لہجہ بدلنے کا ارادہ تو نہیں تھا

یاسر رضا آصف

غزل

ناتوانی راستے کی فکر تھی
آدمی تھا ، حوصلے کی فکر تھی

سود مندی کا فقط وہ ڈھیر تھا
اس کو اپنے فائدے کی فکر تھی

سر جھکائے شرم سے بیٹھا رہا
نوجواں کو فیصلے کی فکر تھی

مَیں حدِ امکاں سے آگے بڑھ گیا
دوستوں کو دائرے کی فکر تھی

وہ فقط اپنے لئے سرگرم تھا
اور مجھ کو قافلے کی فکر تھی

دوست سر کی چوٹ سے بے ہوش تھا
ذہن و دل میں حافظے کی فکر تھی

رابطہ ان سے خیالی کٹ گیا
جن سے مجھ کو رابطے کی فکر تھی

زبیر خیالی

غزل

دیارِ ہجر کو سیراب کرنے والے تھے
کسی کے خواب جو بے خواب کرنے والے تھے

میں جاگ اُٹھا ہوں مقدر سے جاگ اُٹھا ہوں
وہ مجھ کو اور گراں خواب کرنے والے تھے

وہ لوگ کیا ہوئے کن وادیوں میں ڈوب گئے
سمندروں کو جو پایاب کرنے والے تھے

شکست خوردہ مسافر وہ کس زمیں کے تھے
جو اہلِ دل کو سزایاب کرنے والے تھے

اُسے ستارہ کیا تھا کہ رات ڈھلنے لگی
ابھی تو ہم اُسے مہتاب کرنے والے تھے

کہاں گئے ہیں وہ ساز و سُرود و نغمہ و رنگ
جو نبضِ وقت کو مضراب کرنے والے تھے

ہوائے وقت نے آخر بُجھا دیے وہ شرر
مرے بدن کو جو برفاب کرنے والے تھے

عجیب ہے کہ ہم اُن کی تلاش میں ہیں ابھی
جو راستے ہمیں غرقاب کرنے والے تھے

گھرے ہوئے کسی اندیشۂ زوال میں ہم
اُجڑتے شہر کو شاداب کرنے والے تھے

وہ حاصلاتِ زمانہ معاملاتِ حیات
اسیرِ حلقۂ گرداب کرنے والے تھے

مجھے ہمیشہ نئے عشق کی خبر دیتے
تمام خواب جو بے خواب کرنے والے تھے

بدل بدل کے وہ منظر ٹھہر گئے کہ نبیل
نظر کو پارۂ سیماب کرنے والے تھے

خُدا کا شکر کہ اُن سے میں بچ گیا ہوں نبیل
وہ ایک کام جو احباب کرنے والے تھے

نبیل احمد نبیل

غزل

اک کنجِ قفس میں جو فسوں بول رہا ہے
حیرت کے لبادے میں سکوں بول رہا ہے

میں دشت کا مارا ہوں مجھے غور سے دیکھو
چہرے پہ تھکن دل میں جنوں بول رہا ہے

اب کس سے میں پوچھوں کہ کسی شے کی ضرورت
ہر بندہ ہی اب کن فیکوں بول رہا ہے

تم لوگ سمجھنے کا تردد ہی نہ کرنا
کچھ بھی نہیں بولے گا وہ یوں بول رہا ہے

اک شخص مری آنکھ میں چپ چاپ پڑا ہے
اک شخص مرے دل کے دروں بول رہا ہے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے بسایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں ، جبر کا گارا

غزل

عجیب حالت کا سامنا ہے، عجیب صورت کا سامنا ہے
کہ ہم غریبوں کو آئے دن اِک نئی مُصیبت کا سامنا ہے

یہ کیسا سیلاب ہے خُدایا؟ مکان پانی میں بہہ گئے ہیں
ہماری دُنیا اُجڑ گئی ہے، ہمیں قیامت کا سامنا ہے

سوات، کالام کے مناظر بھی غم کی تصویر بن گئے ہیں
وطن کی دِل چسپ وادیوں کو بھی آج آفت کا سامنا ہے

دوا مُیسّر نہ کھانا ہم کو، نہ کوئی پُرسانِ حال مولا!
مرے ہیں بُوڑھے، جوان، بچے، یہ کس اذیّت کا سامنا ہے؟

دکھائی دیتے نہیں ہیں کیفی کہیں بھی دِلکش حسین منظر
بڑھی ہے مہنگائی مُلک میں یُوں کہ سب کو دِقّت کا سامنا ہے

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزل

عشق میں صرف اذیت کی تلافی دکھ ہے
اور یہ دکھ بھی مری جان اضافی دکھ ہے

تیرے ہوتے ہوئے جینا بھی بہت مشکل تھا
تو نہیں ہے تو ترے بعد بھی کافی دکھ ہے

اس غزل میں تو ہر اک لفظ کا دل دکھتا ہے
غیر رکھیں جو مردف ، تو قوافی دکھ ہے

میں ترے حکم پہ ہر بار چلا آتا ہوں
اور ہر بار تری وعدہ خلافی دکھ ہے

اپنی غلطی پہ پشیماں بھی نہیں ہوتے ہیں
ایسے لوگوں کی بہرطور معافی دکھ ہے

درد ایسا ہے کہ ہر جز سے نکلتا ہے رضاؔ
پھر بھی ہر حال میں ہم جیسوں کا شافی دکھ ہے

ساجد رضا خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یوں تو تنہا تھے مگر احساسِ تنہائی نہ تھا
لوگ لمحوں کی طرح صدیوں سے کتراتے نہ تھے

غزلیں

میں ہر ہر زاویے سے سوچتی ہوں
الجھ جاتی ہوں جتنا کھوجتی ہوں

میں گردابوں میں تیری چاہتوں کے
ابھرتی ہوں، کبھی میں ڈوبتی ہوں

ہے میری روح میں کیسی اداسی
نہ یاد اُس کو کروں، نا بھولتی ہوں

اگر چاہوں کسی سے بات کرنا
میں ہر اک لفظ، پہلے تولتی ہوں

اُسی کے ہاتھ میں ہر فیصلہ ہے
میں سارے دکھ خدا کو سونپتی ہوں

نائیلہ راٹھور

نیلی آنکھ میں ٹھہرا پانی
یخ بستہ اور گہرا پانی

تجھ کو جتنی بار بھی سوچا
گیلا آنچل کرتا گیا پانی

وقت اُسے ملتا ہی کب ہے
دیکھتا ہے میری آنکھ کا پانی

بکھر نہ جائے بچھڑ نہ جائے سے
یوں اپنی آنکھوں پہ روکا پانی

ہوتے ہیں کچھ لوگ بھی ایسے
پیتے ہیں کو آنکھ کا پانی

فصیحہ آصف خان

غزل

تمنا یوں مچلتی ہے کہ دنیا بھول جاتے ہیں
پھر اک دن یوں بھی ہوتا ہے تمنا بھول جاتے ہیں

یہ اپنی ڈالیوں سے ٹوٹ کر بکھرے ہوئے کچھ پھول
دیارِ غیر میں اک دن مہکنا بھول جاتے ہیں

نہیں ہے یاد تک ان کو اب ان گودوں کی حدت بھی
کہ جن میں بیٹھ کر بچے یہ دنیا بھول جاتے ہیں

جسے بس دیکھ لینے سے یقیں آتا تھا: یہ ہم ہیں
اک ایسا وقت آتا ہے وہ چہرہ بھول جاتے ہیں

وطن سے دور آئے ہم تو پھر کچھ کچھ سمجھ آیا
شگوفے شاخ سے ٹوٹیں تو کھلنا بھول جاتے ہیں

ترے پیکر یہ مٹی کے ٹھکانے بھول جاتے ہیں
کہ جن قبروں سے آتے ہیں وہ رستہ بھول جاتے ہیں

تمہارے پیار سے کم تر سبھی رشتے ہیں دنیا میں
تمہارے سامنے، ماں! ہم یہ کہنا بھول جاتے ہیں

جو خوش رہنا ہے جیون میں تو بھولو ہر تمنا کو
تمہاری مان لی، بابا! لو اچھا، بھول جاتے ہیں

خزاں رت میں اگر پتے بچھڑ جاتے ہیں شاخوں سے
ہوا کا رزق بنتے ہیں، ٹھکانہ بھول جاتے ہیں

بشیر احمد! تمہیں گھر لوٹنا ہے شام سے پہلے
سفر میں رات ہو جائے تو رستہ بھول جاتے ہیں

بشیر احمد حبیب

غزل

سبھی کو لگتا ہے لیکن عذاب کچھ بھی نہیں
نظر کا پھیر ہے ورنہ خراب کچھ بھی نہیں

نہیں ہے کچھ بھی مرے سامنے تری دنیا
کہ جیسے دریا میں بنتا حباب کچھ بھی نہیں

نمود پانے کو ترسے گا تیرا خواب اگر
تری نگاہ میں الفت کا باب کچھ بھی نہیں

بلا کے لاؤ انہیں میں فلک دکھاتی ہوں
جو کہہ رہے ہیں کہ اب زیرِ آب کچھ بھی نہیں

پڑھا جو ہیر کا قصہ تو یہ یقین ہوا
بدن کے سامنے روحوں کا باب کچھ بھی نہیں

ہم ایسے آب نوردوں کی آنکھ میں تو سمن
تمہاری راہ میں پڑتا سراب کچھ بھی نہیں

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو ٹھہرے دیوانے بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالد پاگلوں کو گھیرے ہیں

غزل

زاغِ شب کے آنگن میں پہروں چلچلاتا ہوں
شامِ غم کے لقّا کو دانہ میں کھلاتا ہوں

دن کے نحس کوّوں کو جن کو لوگ دُھتکاریں
شب کے صحنِ آزردہ میں اُنھیں بُلاتا ہوں

دوپہر کے شانے پر سر رکھے میں آشفتہ
شامِ ہجر کی آنکھوں میں دیے جلاتا ہوں

بیٹھے اونٹ کِس کَل یہ کون جانتا ہے آج
ریگِ عشق پر مثلِ اُونٹ بلبلاتا ہوں

دل کی شمعِ کُشتہ کو شب دیا سلائی سے
عارضِ لگاوٹ پر شمع رُو جلاتا ہوں

سرفراز عارض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

غزلیں

کرتا ہے سچ یہاں تو پنپتا ہے جھوٹ اب
لگتا ہے میرے دیس میں سچا ہے جھوٹ اب

مہمانِ ذی وقار کی صورت وقار سے
بچوں کے درمیاں سے گزرتا ہے جھوٹ اب

کیا خوشنما پرندے تھے سچ کے یہاں وہاں
کیا بدنما چھڑی سے اڑاتا ہے جھوٹ اب

جیسی سہولتیں ہیں میسر اِسے جناب
سچ بولنے سے لکھنے سے اچھا ہے جھوٹ اب

سب کا ذہینِ شہر ہی مسند نشیں ہوئے
اس دور میں ہے جھوٹ کہ رسوا ہے جھوٹ اب

سچ بولتے ہیں جیسے کہ سچ بیچتے ہوں یہ
اس کے عوض سبھی نے کمایا ہے جھوٹ اب

جو سچ تھا اس کو پاس نہ آنے دیا کبھی
پہلو میں اپنے سب نے بٹھایا ہے جھوٹ اب

حامی نہیں ہوں جھوٹ کا لیکن عزیزِ من
دیوار و در پہ سب نے سجایا ہے جھوٹ اب

سچے بھی اب گریزاں ہیں سچ سے یہاں عطا
ایسا گلی محلوں میں چھایا ہے جھوٹ اب

عطا العزیز

پوچھوں میں کچھ اور تو مجھ کو اور بتایا جاتا ہے
سناٹے کی بابت مجھ کو شور بتایا جاتا ہے

اپنی ذات کے بارے میں جب کیا ہے استفسار
اور کرو کچھ اور کرو تم غور بتایا جاتا ہے

ورنہ پھر تیار رہو تم مٹنے کو اس دنیا سے
بدلے نہ گر تم نے اپنے طور بتایا جاتا ہے

اُن لوگوں پہ ظلم نہ کرنا اُن سے ڈرتے رہنا تم
جن کی آہیں رب بھی سنے فی الفور بتایا جاتا ہے

بائی پاس سے ہو لو تم یہ شہر ہے ظالم لوگوں کا
اس بستی میں ہر اِک اہلِ جور بتایا جاتا ہے

مٹی ہے زرخیز مگر یہ مٹی تو بدقسمت ہے
پھول بکھیرو اُگ پڑتے ہیں تھور بتایا جاتا ہے

میرے عہدِ عہد شکن کو کہیں گے اچھا لوگ عطا
آنے والا ہے اِک ایسا دور بتایا جاتا ہے

غزل

تو معتبر ہے آج بھی میرے یقین سے
اک دن! نکل کے دیکھ ذرا آستین سے

دھتکار کر فقیر کو مسجد کے در پہ آپ
دھو بیٹھیے گا ہاتھ نہ دنیا و دین سے

تطہیر ہے سند تری عصمت کے باب میں
تو مستند ترین ہے مسند نشین سے

کل خواب میں حسینؑ کی چوکھٹ ہوئی نصیب
اب تک جو نور پھوٹ رہا ہے جبین سے

مجھ سے نکل رہا ہوں کوئی میں نیا نیا
کچھ تو نکل رہا ہے مری چھان بین سے

''ایکشن'' سے ''کٹ'' کے بیچ ہوئی زندگی تمام
دل بھر گیا تھا فلم کے پہلے ہی ''سین'' سے

شہرِ سخن میں ایک نیا راستہ ہوں میں
فن کو میں بے مثال کروں بہترین سے

رمیض نقوی

غزل

لبادہ اوڑھ کے دشمن مجھے ملتا ہے بھائی کا
مجھے امکان ہے اس شہر، میں اپنی تباہی کا

شرافت نام کی کوئی نشانی تک نہیں ملتی
کہوں کیا اس زمانے کو، برائی کا بھلائی کا

ہمیشہ ناز، اپنے، زورِ بازو پر کیا جائے
توقع کیا، بھروسہ کیا، کسی طاقت پرائی کا

خود اپنی ذات سے ہوتی نہیں جس کو وفاداری
کرے وہ کس طرح شکوہ، کسی طاقت پرائی کا

وہ پل میں چھین لیتا ہے دلوں کو اس طرح عاصم
عطا قدرت نے فن اس کو، کیا ہے دل ربائی کا

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

غزلیں

گو کہ اپنی مدد سے نکلا ہوں
ایک رنگین زد سے نکلا ہوں

تجھ کو اپنا کروں یا ہو جاؤں
میں کہاں رد و کد سے نکلا ہوں

کیا حقیقی ہے کیا مجازی ہے
جذبۂ خیر و بد سے نکلا ہوں

زعم تھا ساتھ ساتھ ہوں تیرے
زعم میں اپنی حد سے نکلا ہوں

چاہتا ہوں کروں نئی باتیں
غمزہ و خال و خد سے نکلا ہوں

مجھ کو ڈالا نہیں گیا جس میں
جانے کیوں اس لحد سے نکلا ہوں

خود کو اپنے ہی سامنے پاکر
آج اپنے ہی قد سے نکلا ہوں

انصر رشید انصر

گردش وقت کا یہ کہنا ہے
جو بھی ہونا ہے ہو کے رہنا ہے

کس سے منت کریں رہائی کی
طوق مرضی سے ہم نے پہنا ہے

درد جب دل سنبھال پایا نہیں
درد پھر آنکھ سے تو بہنا ہے

ہجر آسیب بس گیا دل میں
وصل نے اب کہاں پہ رہنا ہے

چاک دامانی و گریبانی
تیرے عشاق کا یہ کہنا ہے

تیرے بن زندگی نہیں گرچہ
سانس کا درد پھر بھی سہنا ہے

غزل

جب میری توجہ کی نمی اس کو ملی ہے
تب جا کے کہیں شاخِ شجر سبز ہوئی ہے

یہ رات ہے اور رات کے اَسرار الگ ہیں
دیوار بھی بولے گی ابھی سوچ رہی ہے

میں امن کا قائل ہوں مگر پھر بھی بتادوں
وہ سامنے خنجر ہے، یہ تلوار رکھی ہے

آغاز بھی ہے یاد تو انجام بھی مجھ کو
ہاں بیچ میں اک بات تھی وہ بھول گئی ہے

تم خود ہی کہو تازہ ہوا آئے کہاں سے
اس شہر میں دیوار پہ دیوار چڑھی ہے

خاموشی سے گھبرا کے میں اس زور سے چیخا
دیوار بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہی ہے

ہم جیسے مضافات کے لوگوں کا یہ دکھ ہے
اس شہر میں دن چھوٹا ہے اور رات بڑی ہے

کمرے میں بھی آئے گی ذرا دیر کو چڑیا
دیوار پہ وہ دھوپ ابھی سینک رہی ہے

محمد نور آسی

غزل

ہوائے سرد تری دشمنی ہے اپنی جگہ
حرارتوں سے مری دوستی ہے اپنی جگہ

ہر ایک شخص کا اپنا مقام ہوتا ہے
فقیری اور ہے پیغمبری ہے اپنی جگہ

بطور مشغلہ یہ کھیل موت کا کھیلا
وگرنہ خوف بھری زندگی ہے اپنی جگہ

وہ مجھ سے روٹھ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
اندھیرا اپنی جگہ روشنی ہے اپنی جگہ

خدارا نقل مکانی کا نام مت دو اسے
گھروں کے ہوتے ہوئے بے گھری ہے اپنی جگہ

بہار آنے نہ آنے کا مسئلہ ہی نہیں
پرانے پھولوں کی جو تازگی ہے اپنی جگہ

میں دوڑ دوڑ کے جاتا ہوں خاص راہوں پر
وہ انتظار میں شائد کھڑی ہے اپنی جگہ

تمھارے شہر سے اکتا کے لوٹ جاؤں گا
ہماری گاؤں میں اب بھی پڑی ہے اپنی جگہ

شہباز حیدر

غزل

میری چنری میں کوئی بھی سلوٹ نہیں
مَیں زمانے! تری زُلف کی لٹ نہیں

گاؤں میں اب پرانی وہ بیٹھک نہیں
اور تالاب کے پاس پنگھٹ نہیں

اب تو دل کے مکاں کے یہ حالات ہیں
کوئی زینہ نہیں، کوئی آہٹ نہیں

ضبط کر، سوچ لے، دیکھ لے، بھانپ لے
اے مرے دل! ٹھہر، پیار جھٹ پٹ نہیں

کھوجتی ہوں، کہیں تیرا در ہی نہیں
ڈھونڈھتی ہوں، کہیں تیری چوکھٹ نہیں

دھڑکنو! چپ کرو، یاد آتے ہیں وہ
اس خموشی میں تھوڑی بھی کھٹ پٹ نہیں!

تُو مسافر کہاں عشق کے دشت کا
پاؤں میں کوئی چھالا نہیں، پھٹ نہیں

جب سے بچھڑا ہے مجھ سے مرا ماہتاب
آسماں پر ستاروں کا جھرمٹ نہیں

شہر ہے یا کہ خاموش مرگھٹ جیا
کوئی دُلہن نہیں، کوئی گھونگھٹ نہیں

جیا قریشی

غزل

اِسی میں ہجر کے شام و سحر ٹھکانے لگے
جب آئنے کے نئے خال و خد بنانے لگے

طلب کی راہ میں شامل تھی خود پسندی بھی
میں تیری سمت چلا پاؤں لڑکھڑانے لگے

میں سو رہا تھا تو آنکھوں میں کوئی خواب نہ تھا
میں اُٹھ گیا تو تسلسل سے خواب آنے لگے

کئی خیال تری جستجو میں خاک ہوئے
جو تھک گئے تو اسی خاک کو اُڑانے لگے

تمہارے شہر سے ہجرت کا وقت آ گیا ہے
کوئی بھی روکنے والا نہیں سو جانے لگے

فلک سے چاند زمیں کے قریب آیا تو
کنارِ چشم کئی تارے ٹمٹمانے لگے

یقیں کے پھول پہ جو رنگ آیا ہے تیمور
اِسے بنانے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

سید تیمور کاظمی

غزل

لیے ہوئے ہے ہمیں زیرِ دام تاریکی
مٹائے دیجیے ماہِ تمام! تاریکی

ہمارے ملک کی حالت بھی دیکھیے آقا
نظامِ کار ہے تیرہ نظام تاریکی

امیدِ صبحِ منور پہ پانچ سال کے بعد
خرید لیتے ہیں پھر سے عوام تاریکی

متاعِ سود و ہوا و ہوس کی کثرت سے
پکڑتی جائے ہے دل میں دوام تاریکی

اے روشنی کے پیمبر بس ایک نوریں جھلک
ہوئی ہی جاتی ہے دنیا میں عام تاریکی

طفیلِ گنبدِ خضریٰ ہو بارشِ انوار
کہ ایک آن میں ہو سبز فام ، تاریکی

خدایا بھیج کوئی ایسا حکمران کہ جو
بدل دے روشنیوں میں تمام تاریکی

چراغِ اسوۂ احمد اگر نہ ہاتھ میں ہو
دکھائی دینے لگے گام گام تاریکی

حسنین مظہری

غزل

دیکھ مستی وجود کی میری
تا ابد دھوم مچ گئی میری

تُو توجہ اِدھر کرے نہ کرے
کم نہ ہو گی سپردگی میری

دل مرا کب کا ہو چکا پتھر
موت تو کب کی ہو چکی میری

اب تو برباد کر چکے، یہ کہو
کیا اسی میں تھی بہتری میری؟

میرے خوش رنگ زخم دیکھتے ہو؟
یعنی پڑھتے ہو شاعری میری؟

اب تری گفتگو سے مجھ پہ کھُلا
کیوں طبیعت اداس تھی میری

زندگی کا مآل اتنا ہے
زندگی سے نہیں بنی میری

چاند حسرت زدہ سا لگتا ہے
کیا وہاں تک ہے روشنی میری؟

اب میں ہر بات بھول جاتا ہوں
ایسی عادت نہ تھی، کہ تھی میری؟

میری آنکھوں میں آ کے بیٹھ گیا
شامِ فرقت اجاڑ دی میری

پہلے سینے میں دل دھڑکتا تھا
اب دھڑکتی ہے بے دلی میری

کیا عجب وقت ہے بچھڑنے کا
دیکھ، رکتی نہیں ہنسی میری

خود کو میرے سپرد کر بیٹھا
بات تک بھی نہیں سنی میری

تیرے انکار نے کمال کیا
جان میں جان آ گئی میری

میں تو پل بھر نہیں جیا ناشط
عمر کس نے گزار دی میری

ناشط مقبول

غزلیں

باعثِ آزار ہو جاتے ہیں لوگ
راہ کی دیوار ہو جاتے ہیں لوگ

عاقل و ہشیار ہو جاتے ہیں لوگ
جب کبھی زردار ہو جاتے ہیں لوگ

عشق ہو جانے سے پہلے سوچ لو
عشق میں بیکار ہو جاتے ہیں لوگ

پہلے سب ہوتے ہیں سادہ اور پھر
سیکھ کر فنکار ہو جاتے ہیں لوگ

زندگی نعمت خدا کی ہے اگر۔۔۔
اس سے کیوں بے زار ہو جاتے ہیں لوگ

ہم جنھیں آساں سمجھتے ہیں غنی
بس وہی دشوار ہو جاتے ہیں لوگ

غنی الرحمٰن انجم

سوچ سمجھ لفظوں کو تول
پھر جو آئے جی میں بول

میٹھی میٹھی باتیں کر
میٹھا میٹھا سب سے بول

سب کے اپنے اپنے دام
سب کے اپنے اپنے مول

میرے بندے میں سنتا ہوں
میرے بندے مجھ سے بول

دیکھو پھر کب ملتے ہیں
دیکھو دنیا کتنی گول

سب کو اچھے لگتے ہیں
دور کے بجنے والے ڈھول

غزلیں

زخم مرہم کا طلبگار ہو ایسا بھی نہیں
زندگی طالبِ آزار ہو ایسا بھی نہیں

دل کا ویرانہ پری خانہ بنایا جس نے
وہ تصور ابد آثار ہو ایسا بھی نہیں

نظر آتے نہیں ہاتھوں کی لکیروں میں بھی
اور انہیں پیار سے انکار ہو ایسا بھی نہیں

عنبرین خان

چپ وہ بھی ہوا درہم و دینار کے آگے
کیا ذرے کی وقعت بھلا انبار کے آگے

آثار نئی ایک رکاوٹ کے ہیں ظاہر
پھر سایۂ دیوار ہے دیوار کے آگے

سب ہنسنے لگے سادہ دلی دیکھ کے میری
خوشبو کا حوالہ دیا تلوار کے آگے

جرم تسلیم کیا جس نے سمجھ کر اعزاز
وہ حقیقت میں خطا کار ہو ایسا بھی نہیں

اک قناعت سی قناعت ہے کہ چپ ہیں ورنہ
جو میسر ہے وہ معیار ہو ایسا بھی نہیں

ممکن ہی نہیں اور کسی طرح افاقہ
لے آئیں دوا دید کی بیمار کے آگے

اس جانِ محبت کو ذرا یاد کرو تم
کیا زیست کی تلخی ہے غمِ یار کے آگے

غزل

شمسیلہ سعید

کب کسی مسئلے کو ٹالا ہے
بس فقط خود کو مار ڈالا ہے

کیوں برستی ہیں دلنشیں آنکھیں
کیا ان آنکھوں میں کوئی چھالا ہے

چاندنی رات ہے افق پر یا
یہ تری یاد کا اجالا ہے

میں نے کب خواہشوں کے سانچے میں
اب کسی آرزو کا ڈھالا ہے

مجھ سے دوری بنائے رکھنے کا
اس نے خود راستہ نکالا ہے

مسکرا کر اداس کرتا ہے
اس کا انداز ہی نرالا ہے

کیوں ستارے بچھے ہیں راہوں میں
کیا کوئی اور آنے والا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہو کی دھار نے تن روشنی میں ڈھال دیئے
سروں کے ساتھ ہوا میں دیے اُچھال دیئے

غزل

باعثِ غم ہے یہ خبر شاید
جل رہے ہیں غزہ کے گھر شاید

پھر ابابیل بھیجنا یا رب
ظلم حد سے بڑھے اگر شاید

آس برسوں لگائے بیٹھے ہیں
آئے گا وہ ہمیں نظر شاید

ان اندھیروں میں اک سہارا ہے
شب میں چمکا ہے پھر قمر شاید

میں اکیلا ہوں آج رستے میں
مل ہی جائے گا ہم سفر شاید

کر کے ویران بزم کی رونق
جا چکا ہے وہ اپنے گھر شاید

پانی دیتے رہو جڑوں میں ثمر
سبز ہو جائے گا شجر شاید

سمیع احمد ثمر

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

خاتمہ بے خیر: لانگ مارچ تو ناکام ہو گیا لیکن پیچھے اپنے اثرات چھوڑ گیا۔ ڈرامہ اسی انداز میں چل رہا تھا جیسا کہ سکرپٹ رائٹرز نے لکھا تھا۔ پہلے ایکٹ میں حکومت کی غیر مقبولیت، عوام کی بے چینی، نااہلی اور کرپشن کے واقعات کا اُجاگر کرنا تھا۔ دوسرے ایکٹ میں سارا کام پیر فرتوت نے کرنا تھا۔ غلام اسحاق خان وزیرِ اعظم کو اس قسم کی چٹھیاں لکھ کر سرزنش کرتا جس طرح ایک پرائمری سکول کا اُستاد بچے کو آموختہ یاد کرنے پر ڈانٹتا ہے۔ یہ کس قسم کا پارلیمانی نظام تھا جہاں وزیرِ اعظم پارلیمان کے بجائے ایک سابق بیوروکریٹ کو جواب دہ تھا۔ ان تنبیہی نوٹس میں ایک عجیب قسم کی بے زاری اور نفرت جھلکتی

تھی۔ کیسا ہی کمزور وزیراعظم کیوں نہ ہو زیادہ دیر تک اس قسم کی ''بے ہودگیوں'' کو برداشت نہیں کرسکتا۔ جب میاں صاحب نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا تو آخری ایکٹ پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ ترکی تمام شد، غلام اسحاق نے 58.2.B کا استعمال کر کے وزیراعظم کو یک بینی و دوگوش نکال باہر کیا۔ صوبائی وزارت علیہ کے لئے دیپال پور کے جنگل کا شیر پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا۔ صوبائی ممبران اسمبلی اس طرح اس کی طرف دوڑے جیسے وہ تنکے کا جانگلی نہ ہو بلکہ شہد کا چھتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غلام حیدر وائیں کی زنبیل خالی ہوگئی اور وٹو وزیراعلیٰ بنادیا گیا۔ میاں منظور وٹو صوبائی اسمبلی کا سپیکر تھا۔ طویل عرصہ سے وہ وزارت علیہ کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جب غلام اسحاق نے دعوت دی تو اس کے لبیک کہنے کی آواز سارے پنجاب نے سنی۔

وائیں نے چارج چھوڑنے میں دیر نہ کی۔ اپنا پرانا ٹرنک اُٹھایا اور پبلی ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈیوس روڈ پر مسلم لیگ کے دفتر منتقل ہوگیا۔ اس کی بیگم مجیدہ وائیں وزیراعلیٰ ہاؤس چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ بے چاری نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی ڈھب کا کمرہ دیکھا تھا جس میں ایئرکنڈیشنر بھی لگے ہوئے تھے۔ اس کو کسی نے بتایا کہ رولز کے تحت وزیراعلیٰ چھ ماہ تک مکان رکھ سکتا ہے۔ وہ انہی رولز کے سہارے گرمیاں اس آرام دہ ماحول میں گزارنا چاہتی تھی۔ وائیں نے اُسے سمجھایا نیک بخت رولز کو بھول جاؤ۔ اس کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے وائیں صاحب نے صاحبزادی محمودہ بیگم کو کہہ کر مجیدہ کو اس کی کوٹھی میں ایک کمرہ دلوادیا۔

وٹو صاحب نے آتے ہی چمڑے کے سکے چلانا شروع کردیئے۔ ہر اس شخص کو منتوب کیا جو میاں نواز شریف کے قریب تھا۔ چوہدری اقبال گجر اور ملک سلیم اقبال بھی پہلے ہلے میں اس کے گروپ میں شامل ہوگئے۔ اس نے میری طرف خصوصی پیغام بھجوایا۔ رحیم یار خان کے سادات گروپ کو میرے کیمپ میں لے آؤ تمہیں کمشنر بہاولپور لگا دوں گا وگرنہ او ایس ڈی کی اوقات اور حالات کو جانتے ہی ہو۔ یہ پیغام چوہدری اقبال لایا۔ میں نے انکار کردیا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ سیاسی آدمیوں کو اس کے گروہ میں شامل کروں پھر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ میری بات مان جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے دوسرے روز ایک نادر موقع ملا لیکن میں نے فائدہ نہ اُٹھایا۔ سردار خورشید (مرحوم) کے گھر بیٹھے تھے۔ احمد محمود بھی موجود تھا۔ اس نے نواز شریف کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ میں چاہتا تو اسے وزارت کا لالچ دے کر وٹو کے پاس لے جاسکتا تھا۔ میں نے سرزنش کی۔ یہ احسان فراموشی ہوگی اگر مخالفت کرنا تھی تو اس وقت کرتے جب اقتدار میں تھا۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کی بجائے ڈوبتی آگ کو سلام کرنا کہیں بہتر ہے۔ تسنیم نواز گردیزی بھی موجود تھا۔ اس نے تائید کی۔

وٹو نے اپنے عہد کا پاس رکھا اور مجھے او ایس ڈی لگادیا۔ میرے جانشین راجہ عباس کو چارج لینا تھا۔ پتہ چلا وہ چند دن بعد آئے گا۔ میں نے کامران رسول کو کہا میں انتظار نہیں کرسکتا، میں

آج ہی چارج چھوڑ رہا ہوں۔
اس کی خوشی دیدنی تھی کہنے لگا" بالکل بالکل۔ اسی کو عزت نفس کہتے ہیں۔ آج ہی چارج چھوڑ دو۔ الوداعی کھانے تو چارج چھوڑ کر بھی کھائے جا سکتے ہیں۔ میں نے چارج چھوڑ دیا۔ چند دن بعد اطلاع آئی کہ کامران صاحب کی بھی چھٹی کرا دی گئی ہے اور اُن کی جگہ خلیل بھٹی کو کمشنر لگا دیا گیا ہے۔ خلیل بھٹی نے انھیں عزت نفس کے مظاہرے کا موقع ہی نہ دیا۔ فوراً گوجرانوالہ پہنچ کر چارج سنبھال لیا۔

بیوروکریسی میں جس شخص نے سب سے پہلے پلٹا کھایا وہ رانا مقبول تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ میاں نواز شریف کا سب سے چہیتا افسر تھا۔ جب سانحہ میں آٹھ افراد قتل ہوئے تو وہ ایس ایس پی لاہور تھا۔ میاں صاحب نے ڈی آئی جی کو تو معطل کر دیا لیکن اصل ذمہ دار شخص کو اس کی جگہ ڈی آئی جی بنا دیا۔ پریس اور عوام نے احتجاج کیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ بطور وزیراعظم بھی نواز شریف ہر ہفتے لاہور آتے اور شہر کا دورہ کرتے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ تخت لاہور پر مستقل قبضہ صرف اسی صورت میں جمایا جا سکتا ہے کہ اس کے باشندوں سے مسلسل رابطہ رہے۔ ایک دن وہ یونیورسٹی کیمپس جا رہے تھے کہ انھوں نے ٹریفک میں بے ضابطگی دیکھی ۔ غصے سے پوچھا "ٹریفک کا انچارج کون ہے؟"

رانا مقبول نے کہا" ڈی آئی جی ٹریفک" حالانکہ لاہور کی ٹریفک کا انچارج وہ خود تھا۔ ڈی آئی جی کو ٹریفک سے ہٹا دیا گیا۔ چیف سیکرٹری یا آئی جی کو یہ بتانے کی ہمت نہ ہوئی کہ اصل کرتا دھرتا تو وہ شخص ہے جو جناب کی بغل میں کھڑا ہے۔ چیف سیکرٹری اور آئی جی بھی اس سے ڈرتے تھے۔

جب وٹو وزیر اعلیٰ بنا تو یہ فوراً اس کے گروپ میں نہ صرف شامل ہو گیا بلکہ راجپوت ممبران اسمبلی توڑنے کا وعدہ بھی کیا۔ سب سے پہلے وہ رانا پھول خان کے بیٹوں کے پاس گیا۔ وہاں دیگر راجپوت ممبران کو جمع کیا۔ کہنے لگا" پہلے میں وٹو حکومت کا ساتھ دینے کے فائدے گنواؤں یا نقصانات کا تخمینہ لگاؤں۔ فائدہ یہ ہے کہ اب نواز شریف واپس نہیں آئے گا اس لئے حکومت وقت کا ساتھ دینا چاہیے۔ آپ کو فنڈز ملیں گے وزارت کا بھی امکان ہے، تھانیدار، تحصیلدار اور پٹواری اپنی مرضی کے لگوا سکو گے، علاقے میں ٹہکا ہو گا۔ نقصانات، فنڈز بند ہو جائیں گے۔ آپ کے خلاف پرچے درج ہو سکتے ہیں، مخالفین کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملے گا۔ تم سب خس و خاشاک کی طرح بکھر جاؤ گے۔" انہوں نے انکار کر دیا۔ جب غصے میں واپس جانے لگا تو رانا پھول کے لڑکے نے کہا" اب ایک بات ہماری بھی سنتے جاؤ۔ اپنے نام کے ساتھ رانا لکھنا چھوڑ دو۔"

میاں نواز شریف نے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ عدالت عظمیٰ نے صدر کا حکم کالعدم قرار دے دیا۔ وہ وزارت عظمیٰ پر تو بحال ہو گئے لیکن اقتدار پر دوبارہ قابض نہ ہو سکے۔ فیصلہ سنتے ہی اسمبلی کے سب پنچھی پھیرو ایک مرتبہ پھر میاں صاحب کے کیمپ میں واپس آ گئے لیکن اس کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ وٹو نے عملاً ان کا پنجاب میں داخلہ بند کر دیا۔ سارے ایم پی اے اس کے ڈر سے

دوڑ کر اسلام آباد چلے گئے۔ میاں صاحب نے جاوید قریشی کی جگہ پرویز مسعود کو چیف سیکرٹری پنجاب لگا دیا۔ آئی جی، اصغر ملک کو بدل کر اقبال چیمہ کو انسپکٹر جنرل پولیس لگا دیا۔ ڈٹو نے ان احکامات کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ ایس ایس پی حاجی حبیب الرحمٰن کو ہدایت کی کہ اس کو کوٹھی سے نکال دیا جائے۔ پولیس کے سپاہی بھاری بوٹ پہن کر پرویز مسعود کی کوٹھی میں پریڈ کرنے لگے۔ قدموں کی دھپ دھپ سے وہ پریشان تو پہلے ہی تھا ایس ایس پی نے آ کر اسے مزید ڈرا دیا۔ بولا "سر! آپ کی گرفتاری کا حکم نامہ آ چکا ہے۔ پرانے تعلقات کی بنا پر میں آپ کو گرفتار نہیں کرنا چاہتا، آپ دوڑ جائیں۔" طارق فاروق نامزد کمشنر کو لے کر پرویز مسعود نے وہ رات چیف جسٹس محبوب کی کوٹھی کی انیکسی میں گزاری۔ صبح جب ضمانت قبل از گرفتاری منظور ہوئی تو دونوں اسلام آباد دوڑ گئے۔ اقبال چیمہ بھی چارج نہ لے سکا۔ جی اصغر ملک نے ایک فرمان Order of the day جاری کیا جس میں کہا گیا کہ کوئی اقبال چیمہ نامی شخص اپنے آپ کو آئی جی پنجاب ظاہر کرتا ہے اس بہروپیے کی کسی بات پر دھیان نہ دیا جائے اور ہر تھانے میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔

میاں صاحب کے پاس باقی کیا رہ گیا تھا۔ ٹی وی پر غلام اسحاق کے خلاف تقریر کر ڈالی۔ جواب آں غزل کے طور پر اس نے بھی انہیں بالواسطہ جنرل آصف نواز کا قاتل قرار دیا اور اعلان کیا کہ مقتول کے جسم کے کچھ حصے لیب ٹیسٹ کے لئے امریکہ بھجوائے جا رہے ہیں۔ نصف شب کے بعد اس کی تقریر نشر ہوئی۔ اس کی صحت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی بات کرتا تو منہ سے رالیں ایک پہاڑی جھرنے کی مانند بہہ اٹھتیں۔ ہر دفعہ چھوٹا تولیہ استعمال کرنا پڑتا جو کھل بھیگ جاتا۔ جنرل وحید کاکڑ نے ہر دو کو بلا کر استعفیٰ مانگا۔ دونوں نے بلا چوں چرا استعفیٰ دے دیا۔ جب ایم این ایز کو پتہ چلا کہ جو کے ساتھ گھن بھی پسنے والا ہے تو انہوں نے اسمبلی بچانے کی کوشش کی۔ میاں نواز شریف کے خلاف تحریک عدم اعتماد، اس صورت میں چاہے خود چلا جاتا لیکن اسمبلی نہ توڑ سکتا تھا۔ ان کو اس بات سے غرض نہ تھی کہ وہ خود رہتا ہے یا جاتا ہے۔ تسنیم نواز گردیزی کے گھر میٹنگ ہوئی۔ سب ممبروں نے تحریک عدم اعتماد پر دستخط کرنے کا عندیہ دیا۔ ابھی بحث جاری تھی کہ جنرل وحید کاکڑ کا گردیزی کو فون آ گیا۔ بولا

I understand you are holding"
"a meeting in your house.
"Yes sir"
"Call that off"

فون بند ہو گیا اور یہ سنتے ہی سب ممبر دوڑ گئے۔ عبوری وزیر اعظم، معین قریشی! عبوری وزیر اعظم کے لئے معین قریشی کا نام تجویز کیا گیا۔ معین قریشی کا تعلق پاکستان سے صرف اس قدر تھا کہ وہ کبھی یہاں پیدا ہوا تھا۔ بہت پہلے وہ پاکستان سے ہجرت کر کے امریکی شہریت قبول کر چکا تھا۔ اس کا پاکستان میں کوئی گھر نہ تھا۔

زمین نہیں تھی، حتیٰ کہ یادیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ وہ اس وقت سنگاپور کے ایک ہسپتال میں کینسر کا علاج کروا رہا تھا۔ جس کسی نے بھی ایک جاں بلب مریض کو اس بدقسمت ملک کا وزیراعظم بنانے کا سوچا اسے بے محابا داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک بیمار قوم کے لئے مریض وزیراعظم ہی سُود مند ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اسے عوارض کی تکلیفوں کا ادراک ہوتا ہے۔

قریشی نے آتے ہی چند اہم کام کیے۔ سب سے پہلے تو موٹروے کی تعمیر رکوا دی۔ چھ لین کو چار لین میں بدلنے کا حکم دیا۔ جب سے حکومت نے اس کی تعمیر کا ٹھیکہ کورین کمپنی ڈائیو کو دیا تھا، امریکن تلملا رہے تھے۔ جب ایک دفعہ کوئی سونے کی کان کی راہ دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کا راستہ روکنا دشوار ہو جاتا ہے۔

دوسرا اس نے والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نہ اسے علم تھا کہ قبر کہاں ہے اور نہ پولیس کچھ کھوج لگا سکی۔ اسی کشمکش میں ایک بوڑھے حوالدار نے جگے کی لاج رکھ لی۔ کہنے لگا "مجھے علم ہے کہ (مرحومہ) کس گوشے میں سکون کی نیند سو رہی ہیں۔" سب حیران ہوئے۔ اگلے دن وہ انہیں میانی صاحب میں ایک قبر پر لے گیا۔ جس پر تازہ پھول چڑھے تھے۔ اگر بتیاں جل رہی تھیں اور لوبان کی خوشبو سے فضا معطر ہو رہی تھی۔ سنگ مرمر کے ایک کتبے پر مرحومہ کا نام بھی لکھا تھا۔ وزیراعظم آئے انہوں نے فاتحہ پڑھی اور پولیس کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے واپس چلے گئے۔

آخر کوئی تو ایسا شعبہ ہے جس میں ہماری پولیس آگے آگے دکھائی دیتی ہے اور یہ کام اکثر بوڑھے، تجربہ کار اور خرانٹ حوالدار ہی کرتے ہیں۔ نئے افسروں کو تو سوائے غلط انگریزی بولنے کے کچھ کام نہیں آتا۔

ایک مرتبہ لائل پور میں بھی پولیس کی گلوخلاصی ایک حوالدار نے ہی کرائی تھی۔ ملک وارث ایس پی تھے۔ لاوے کے رہنے والے تھے۔ سخت گیر، غصہ ہمیشہ ناک پر رہتا۔ لائل پور کی کبڈی اور ہاکی کی ٹیمیں جہلم میچ کھیلنے گئیں اور دونوں ہار کر واپس آئیں۔ اب کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس قہر خداوندی کو اس سانحہ کی اطلاع دیتا۔ وہاں بھی ایک حوالدار نور دین نے اپنی خدمات پیش کیں۔ خوشی خوشی ایس پی صاحب کے دفتر میں گیا اور ٹھک سے سلوٹ مارا۔ انہوں نے پوچھا "میچ کا کیا بنا ہے؟"

بولا "عالی جاہ! سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

ایک وہ جیت گئے ہیں اور ایک ہم ہار گئے ہیں۔

"وت ٹھیک ہو گیا اے" ملک صاحب خوش ہو کر بولے۔

وہ فوراً کھسک گیا۔ جب ملک صاحب نے اس کے لفظوں پر پھر سے غور کیا تو بڑے تلملائے۔ بولے "پکڑو، حرامزادے کو۔ اتنے میں وہ دفتر کی حدود پھلانگ گیا تھا پکڑا کہاں سے جاتا۔"

معین قریشی صاحب نے پنجاب کے لئے چیف سیکرٹری بھی اپنا ہم ذات چنا۔ پیدا تو وہ سندھ میں ہوا تھا لیکن لگتا یوں تھا جیسے انگلستان

سے تازہ تازہ درآمد کیا گیا ہو۔ وزیراعظم تو خود مریض تھے وہ اگر کچھ عرصہ پنجاب میں ٹک جاتا تو ساری نوکر شاہی حواس کھو بیٹھتی۔ بڑا اصول پرست تھا اہلیہ محترمہ کو بھی ملاقات کے لئے وقت مانگنا پڑتا۔ کسی افسر کی جرأت نہیں تھی کہ بغیر لاؤنج سوٹ پہنے یا بو لگائے اُسے ملتا۔ عرض داشت کے لفظ بھی گن کر استعمال کرنے پڑتے کیونکہ وہ لمبی بات سننے کا عادی نہیں تھا۔ وٹو نے آ کر ساری بیوروکریسی کی اکھاڑ پچھاڑ کر دی تھی۔ اس نے ایک ماہ بعد ان تمام احکامات پر خط تنسیخ پھیر دیا۔ فیلڈ میں صرف وہ افسر لگائے جو تمام عمر سیکرٹریٹ میں رہے تھے۔ پرانی کہاوت ہے کہ سو سال بعد ''روڑی'' کی بھی سنی جاتی ہے۔ تبادلے سے پہلے ہر افسر کا خود انٹرویو کرتا اور ایک ہی سوال پوچھتا۔ تمہارا تعلق کون سی پارٹی سے رہا ہے۔ جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنا فرمان صادر کر دیتا۔ خلیل بھٹی بھی تبادلے کی زد میں آ گئے۔ کل ایک ماہ کمشنر رہے۔ میں نے از راہ تفنن پوچھا اس گناہ بے لذت کا کیا فائدہ تھا۔ بولے ''کوئی گناہ بے لذت نہیں ہوتا۔ لذت اور گناہ لازم و ملزوم ہیں۔ پتہ نہیں کس فراغت پسند نے یہ اصطلاح وضع کی تھی۔ کل کلاں کسی نے نہیں پوچھنا کہ خلیل کتنے دن کمشنر رہا ہے۔ جب سابقہ کا لاحقہ لگ جائے تو پھر جاتا نہیں۔ خلیل بھٹی، سابق کمشنر گوجرانوالہ! ذرا ان لفظوں کے صوتی اثرات تو دیکھو لو دینے لگتے ہیں۔ خلیل بھٹی زندہ دل انسان تھے، دور ابتلا میں بھی روشن پہلو تلاش کر لیتے۔

چیف سیکرٹری قریشی صاحب الیکشن تک پنجاب میں رہے۔ اس کے بعد پتہ نہ چل سکا کہ کس سمت نکل گئے ہیں۔ البتہ میں نے اتفاق سے ان کا کھوج نکال ڈالا۔ کراچی کسی سلسلے میں گیا۔ وہاں ہاتھ آئی لینڈ میں واقع پنجاب ہاؤس میں ٹھہرا۔ صبح حسب دستور سیر کر کے آ رہا تھا کہ ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک مکان زیر تعمیر تھا۔ مکان کے باہر ایک میز دھری تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا اور سامنے ایک بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ زیر تعمیر مکان قریشی صاحب، سابق چیف سیکرٹری پنجاب کا ہے۔ کوئی صاحب تعمیر کے سلسلے میں رائے دینا چاہیں تو رجسٹر حاضر ہے۔ ہر اچھی تجویز کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں نے رجسٹر کھول کر دیکھا تو تقریباً خالی تھا البتہ ایک صفحے پر کسی سرپھرے نے لکھا تھا۔ اگر سسرے نے ہر تجویز لوگوں سے ہی مانگنی ہے تو پھر آرکیٹکٹ سے نقشہ بنوانے میں کیا تک تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے کہ الیکشن کے بعد بھی ایک قریشی صاحب ہی چیف سیکرٹری بنے۔ اُن کا نام اسلم حیات قریشی تھا اور کام.....؟ ایک دوست کہنے لگا ''اللہ دشمنوں سے بھی وہ کام نہ کروائے۔'' کچھ امور کی نشاندہی حامد میر نے اوسلو میں کر دی تھی۔ وزیراعلیٰ وٹو صاحب بنے، صرف بارہ ووٹوں کے ساتھ۔ گو اپنے حلقے سے الیکشن ہار گئے لیکن ہوشیار انسان تھے، ٹوبہ سے بھی الیکشن لڑا اور کسی طرح جیت گئے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ میں جو چپقلش تھی اس کا

بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ یہ غالباً برصغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ کوئی شخص بارہ ممبروں کے ساتھ ۲۵۴ ممبروں کی اسمبلی کا وزیراعلیٰ منتخب ہوا تھا۔

او ایس ڈی: میں دو ماہ تک او ایس ڈی رہا۔ اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کیا ہوتا ہے۔ اس کے من جملہ فرائض کیا ہیں۔ کون سی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ ایسے کون سے اہم کام ہیں جو حکومت صرف اسے تفویض کرتی ہے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد مجھے سکون نصیب ہوا تھا۔ بغیر چھٹی لئے چھٹیاں کاٹنے کا موقعہ ملا تھا اس لئے سوچا کہ اتنی اہم پوسٹ کو صیغہ راز میں رکھنا عوام سے زیادتی ہوگی۔ لوگوں کا حق ہے کہ وہ اس منصب جلیلہ کے متعلق وہ سب کچھ جانیں جو حکومت نے الفاظ کے لبادے میں چھپا رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کلاں حکومت جواب طلبی کرے کہ اتنے کلاسی فائیڈ راز کو افشا کیوں کیا ہے لیکن کچھ کہے بن رہا بھی تو نہیں جاتا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا:

Sweet are the uses of adversity

وٹو کا رویہ معاندانہ بلکہ مخاصمانہ تھا۔ ایک تو میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تھی اور پھر مجھے وہ نواز شریف کا خاص آدمی سمجھتا تھا۔ تھا تو وہ خود بھی میاں صاحب کا آدمی لیکن اقتدار کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ جب وہ سپیکر صوبائی اسمبلی تھا تو اکثر سفارش کرتا رہتا جب میں فون کرتا بھائی جی کہہ کر بلاتا۔ اس قدر اپنائیت اور لب و لہجے کی مٹھاس! میں سوچتا کہ آدمی ہو تو میاں منظور وٹو جیسا۔ لاہور آ کر ایک مرتبہ اتفاقاً ملاقات ہوئی تو اس نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے جانتا نہ ہو۔ کیا کوئی شخص اخلاق اور مروّت سے اس قدر عاری بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کا جو Image قائم کر رکھا تھا، وہ چکنا چور ہو گیا۔

میں بن مانگی چھٹیاں انجوائے کر رہا تھا کہ سیکرٹری سروسز علی کاظم کا فون آ گیا۔ کہنے لگا ”بہت آرام کر لیا ہوگا۔ تمہیں ایڈیشنل سیکرٹری لیبر مقرر کیا جاتا ہے۔“

محکمہ محنت میں چند سال: میں قریباً تین سال ایڈیشنل سیکرٹری لیبر اور ایڈیشنل کمشنر رہا۔ اس عرصے میں چھ سیکرٹری لیبر بدلے۔ چھٹے نے اتنی مہربانی کی کہ مجھے ہی بدلوا دیا۔ جب میں نے چارج لیا تو ملک جہانگیر سیکرٹری لیبر تھے۔ ملک صاحب کا تعلق پی سی ایس کے ۶۰ کے بیچ سے تھا۔ اس بیچ کے قریباً سارے افسر چنگ تھے۔ ملک جہانگیر، چوہدری نذیر، میاں اکرم، امتیاز ساہی، صفدر اللہ خان، برلاس وغیرہ۔ ملک جہانگیر خوش لباس، خوش شکل، خوش اطوار انسان تھے۔ اپنے مخصوص لہجے میں انگریزی بولتے۔ پراٹوکول کا بڑا خیال رکھتے، ملاقات کے لئے پیشگی وقت طے کرنا ضروری سمجھتے۔ رنگین مزاج تھے لیکن کبھی کوئی اسکینڈل نہ بننے دیا۔ اپنے جونیئرز سے نہایت شفقت سے پیش آتے اور ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے۔ اس بیچ میں سب سے کامیاب افسر چوہدری نذیر تھا۔ Down to earth سنجیدہ، محنتی جسے آنے والے واقعات کا پہلے سے ادراک ہو جاتا

تھا۔ ساری سروس اس قدر محتاط انداز میں کی کہ بسا اوقات سوچ کر ہی اُلجھن ہونے لگتی۔ تمام عمر ناک کی سیدھ میں چلے۔ پانچ سال پنڈی کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ افضل کھوٹ جیسے شخص کے ساتھ گزارا کرنا ان ہی کا کام تھا۔ میاں اکرم اور امتیاز ساہی کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ میاں اکرم طبعاً Happy go lucky type انسان ہیں۔ کافی عرصہ کاکول ملٹری اکیڈمی میں انگریزی ادب پڑھاتے رہے۔ کھوٹ کے بھی اُستاد رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ماتحتی میں بطور ڈی سی سیالکوٹ کام کیا۔ امتیاز ساہی کو سروس کا بازوئے شمشیر زن کہا جا سکتا تھا۔ نڈر، بے باک اور منہ پھٹ، ہزاروں کے مجمعے میں ڈنڈہ لے کر بے خوف گھس جاتا۔ کہتا اگر میں افسر نہ ہوتا تو سر گودھے کا ڈان ہوتا۔ اس نوکری نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی ہیں۔ زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ کی اور رحیم یار خان میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے چل بسا۔ صفدر اللہ خان صرف ۶۰ بیچ ہی نہیں پوری سروس کی شناخت تھا۔ یاروں کا یار، مخلص و خوددار وہ بھی جوانی میں رحلت کر گیا۔ جگر کا کینسر جان لیوا ثابت ہوا۔ میں مزاج پرسی کے لئے گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند دنوں کے مہمان ہیں، ہنس کر باتیں کرتے رہے اور بالکل یہ تاثر نہ دیا کہ وقت آخر آن پہنچا ہے۔ بہادر لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے ہیں، انہوں نے باقاعدہ پنجہ آزمائی کی۔

برلاس صاحب افسر کم اور شاعر زیادہ تھے۔ اس سلسلے میں ایک شعر بھی کہا۔ افسروں میں شاعر ہوں، شاعروں میں افسر ہوں۔ یہ بات مصطفیٰ زیدی برسوں پہلے کہہ چکے تھے، ملتان کی ایک تقریب میں میں نے جب زیدی سے منسوب قصہ سنایا تو مجمع میں سے کوئی شخص بولا "یہ تو برلاس نے کہا ہے" عرض کیا "جب زیدی نے اس کا اظہار کیا تھا تو اس وقت برلاس کا مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا۔" تقریب کی صدارت احمد فراز کر رہے تھے۔ بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ کہنے لگے "کافی عرصہ کے بعد غالب کے شعر کا جائز استعمال کیا گیا ہے۔"

برلاس صاحب نیک انسان ہیں، مجھ سے اکثر ناراض رہتے ہیں۔ گو میں شاعر نہیں ہوں، نثر نگار ہوں، لوگ تو شعروں کے انتخاب میں رُسوا ہوتے ہیں، میں شاعروں کے سلسلے میں معتوب ہوا ہوں۔ برلاس کا اپنا گروپ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس جگہ وہ جائیں سارا ٹولہ شعرا بھی ان کی معیت میں ہو۔ ایک تو داد وصول کرنے میں سہولت رہتی ہے اس طرح ان کی مدد اور سرپرستی بھی ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک طویل عرصہ تک خواہش رہی کہ پنجاب میں کوئی دوسرا افسر مشاعرہ نہ کروائے۔ چونکہ میں نے ہر ضلع میں مشاعرہ کروایا اس لئے ان کی ناراضی بڑھتی چلی گئی۔ ہر دفعہ ہم نے انہیں دعوت نامہ بھیجا لیکن وہ وعدہ کر کے بھی کبھی نہ آئے۔ ان کی بڑی خواہش رہی کہ وزیر اعلیٰ ان کے مشاعرے کی صدارت کرے۔ وائیں نے ہر دفعہ انکار کر دیا۔ بہاولپور میں کمشنر تھے تو مجھے مدعو کیا۔ میں احتراماً چلا گیا۔ حرف سپاس میں مجھے بالواسطہ ہدف بنایا۔ کہنے لگے "میں اپنے

مشاعروں کی وزیروں، امیروں سے صدارت نہیں کراتا اس لئے میں نے صدارت نواب صلاح الدین عباسی کو سونپی ہے۔" مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے کہا "برلاس صاحب! آپ نے ایک اچھا اصول اپنایا ہے لیکن کیا آپ اس قدر بے خبر ہیں کہ مشاعرے کی صدارت سطوت شاہی کے آخری مہرے سے کروا رہے ہیں۔"

ان کا سب سے بڑا مسئلہ بے ہنگم انانیت ہے۔ ہمیشہ خود کو ہم اور باقی سب کو تم کہہ کر پکارتے۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ مشاعرہ اگر احمد ندیم قاسمی کے بعد نہیں تو کم از کم ان سے ایک درجہ پہلے پڑھیں۔ کمشنر بن کر انہوں نے مشاعرے تو کرائے لیکن اہل شہر نے منڈیر پر کئی چاند چڑھتے بھی دیکھے۔

ملک جہانگیر ریٹائر ہوئے تو چوہدری اسلم کو سیکرٹری لگا دیا گیا۔ وہ چہرے مہرے سے ویسے ہی پنشن یافتہ لگتے تھے۔ نوکری میں چند ماہ باقی تھے۔ اہل سیکرٹریٹ اسے آخری ہوٹا دلانا بولتے ہیں۔ خلیل بھٹی آخری دھکا کہتے ہیں۔

فضل حسین شاہ بھی زیادہ دیر نہ رہے۔ دراصل شاہ صاحب کو ساری سروس میں خوب سے خوب تر کی تلاش رہی۔ انہوں نے کہہ سن کر اپنے آپ کو ایڈیشنل چیف سیکرٹری لگوا دیا۔ خلیل بھٹی کامپلیٹ بھی تھے اور کائیاں بھی۔ محنت کے عادی تھے۔ محکمہ محنت ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وڈو سے قریبی تعلق کی بنا پر انہیں سیکرٹری صحت لگا دیا گیا۔ انہیں اپنی صلاحیتیں اُجاگر کرنے کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے تھی۔

شہزاد حسن پرویز بھی کچھ عرصہ رہے Typical civil servant جنہیں نہ زندگی میں کسی سے کام پڑتا ہے اور نہ انہوں نے کسی کو ممنون کرنا ہوتا ہے۔ ساری سروس میں ان کا ایک ہی مسئلہ رہا۔ وہ رانا مقبول کے ہم زلف تھے۔ جب بھی رانا پر دور ابتلا آیا، انہیں ہر بار اپنی صفائی پیش کرنا پڑی۔ رشتہ ضرور ہے لیکن پرواز الگ الگ ہے۔ رانا صاحب ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے کے ماہر تھے انہوں نے ساری سروس میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔

آخری سیکرٹری سید منور چیر تھے، یہ مشہور ادیب عابد علی عابد کے فرزند تھے۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر (مرحوم) نے ان کا فارسی نام رکھا وگرنہ طبعاً ڈیل ڈول اور خصلت کے اعتبار سے ان کا نام مولا جٹ ہونا چاہئے تھا۔

لیبر منسٹر ملک اقبال لنگڑیال تھے۔ ملک صاحب میں خاندانی وجاہت، رکھ رکھاؤ اور حلم و وٹ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سارے محکمے میں صرف مجھ پر بھروسہ کرتے۔ ان کی تقریریں میں لکھا کرتا۔ صاف کہتے "ہم سیاست دان لوگ حلقے میں سیاسی تقریر تو کر لیتے ہیں لیکن شہری محفلوں میں اپنے جوہر نہیں دکھا سکتے۔ آپ نے جو کچھ لکھ کر دینا ہے میں نے من وعن پڑھنا ہے۔" شہری محفلوں میں بھی وہ کامیاب رہے۔ کیونکہ میں صرف ان کی تقریر لکھتا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں ریہرسل بھی کراتا تھا۔ الفاظ کا زیر و بم، فقروں کی نشست و برخاست، جسم کی جنبش، تھک کر ہاتھ جوڑ دیتے لیکن جب تک میری تسلی نہ ہوتی، میں بار بار تقریر پڑھواتا۔

[جاری ہے۔]

پشاور کے چپلی کباب

پشتون کھانوں میں ''کباب'' کو وہی اہمیت حاصل ہے جو داماد کو سسرال میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خیبر پختونخوا کے ''کبابوں'' کی شکل و صورت زیادہ پُرکشش ہوتی ہے، مگر اس کے طبعی اثرات بعض اوقات پیٹ میں اتنی پیچیدگیاں اور مروڑ پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے زبان پر تعریفی کلمات کے بجائے جیب سے ہاضمے والی گولیاں ہی نکلتی ہیں۔

بھئی! ہماری دانست میں تو کباب کو چپلی کباب یا چپل کباب کہنا مضحکہ خیز اور نامناسب ہے کیوں کہ خوراک کی چیز کے ساتھ چپل یا چپلی کا سابقہ لگانا غیر اخلاقی فعل کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر اس کو ہم چپڑ کباب یا چپیڑ کباب کہہ لیں تو بہتر ہوگا کیوں کہ اس کو ہتھیلی سمیت پانچوں اُنگلیوں سے دو تین چپیڑ لگا کر ہی کڑے میں دھکیلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں مشہور و معروف کباب فروش گل کاکا کی ذاتی رائے ہے کہ سیخ کباب اور شامی کباب کو تو میں کباب کی کیٹگری میں شمار ہی نہیں کرتا۔ اصل میں کباب وہ ہے جس کو ہاتھ کی چپیڑوں سے بنایا جائے اور بڑے کڑے کی تلاب میں بار بار غوطے دے کر بنایا جائے۔ ہاں البتہ کبابوں کی کئی اقسام ہیں مثلاً نیم پکا ہوا، مناسب پکا ہوا، انڈوں والا کباب، سرخ براؤن رنگت کا اور بعض زیادہ سیاہ رنگ کے، کم مرچوں والے یا تیز مرچوں والے وغیرہ وغیرہ۔

پٹھانوں کے ہاں تو ''کباب کلچر'' بھی ٹک ٹاک کی طرح پروان چڑھ رہا ہے۔ آج کل تو دُلہن کو منہ دکھائی اور سلامی کے وقت تحفے کے طور پر بھی ''کبابوں'' کے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ نئی نویلی دُلہن سے تو ''پہلی میٹھی ڈش'' کے بجائے ''کباب'' بنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ آج کے جدید سائنسی دور میں بھی ہمارے ہاں بیگمات شوہر حضرات سے چاند تاروں کی

ہمایون خان

تمنا کرنے کے بجائے ''کباب'' لانے کی فرمائش کرلیتی ہیں۔ دوستوں کی محفل ہو یا کوئی تقریب ''کبابوں'' کے بغیر ادھوری سی رہتی ہے۔ پشتون ثقافت اور تہذیب کا خاصہ ہے کہ پٹھان نہ صرف مہمان نواز ہوتے ہیں بلکہ خوراک کے بھی شوقین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کی خوراک کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔ خود بھی زیادہ کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ حضرت! وہ دور گیا جب لوگ محبت کے اظہار و اقرار کے لیے کسی میٹھی چیز کا سہارا لیتے تھے۔ اب تو لذت اور اُلفت سے بھرپور ''کبابوں'' سے بھی اظہارِ محبت کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ بقول شاعر:

محبت میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
کباب اُس نے بھیج دیے ہیں خوراک میں

دُنیا میں انسان جس چیز کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے وہ کھانا ہے۔ کھانا وہ واحد کام ہے جو انسان ساری زندگی کرتا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی نہیں اُکتاتا اگر وہ اس کام سے اُکتا جائے تو یقین کرلیں وہ بیمار ہے یا عاشق۔ یعنی اس کی طبیعت خراب ہے یا نیت۔ شاعری گلوکاری اور اداکاری کی طرح کھانا کھانا بھی فنونِ لطیفہ میں سے ہے۔ کیوں کہ کھانے کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

ہمارے ہاں کباب سنٹرز کو خاص نام دیئے گئے ہیں اور ان ناموں میں ''کڑے'' کا لاحقہ لگا کر کبابوں کی لذت اور اہمیت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''توت کڑے''، ''بابا کڑے''، ''دادا کڑے'' اور ''ماما کڑے'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پشاور، چارسدہ اور مردان کے چپلی کباب بھی مشہور ہیں۔ پٹھانوں میں یہ روایت بھی برسوں سے چلی آرہی ہے خاص طور پر موسم سرما میں کباب سنٹرز کا رُخ کرتے ہیں اور کباب کے لذیذ ذائقوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جہاں تک ''کباب'' کی خوراک اور تیاری کے عمل کا سوال ہے تو کباب قیمہ، پیاز، ٹماٹر، انڈے اور مختلف مصالحوں کا لذیذ امتزاج ہے۔ ''کباب'' کے تیار ہونے کا عمل دُلہن کے جہیز کے سامان کی طرح تیز، بروقت اور ہماری بیگمات کے تیور کے تبدیل ہونے کے عمل کی طرح بڑا ''تھرلنگ'' ہوتا ہے۔

خیبر پختونخوا کے مختلف علاقوں میں نہ صرف کبابوں کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ بعض علاقوں کے ''کباب'' تو بے حد مقبول و معروف ہیں۔ ''کباب'' کے اتنے بہترین سنٹر ہیں اس تناظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف کبابوں کے لئے ہی پیدا ہوئے ہوں۔

صاحبان! ''کباب'' کھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ بعض اوقات ''کباب'' دل

اور معدے پر اس طرح بوجھ بن بن جاتے ہیں جس طرح چھٹی کے دن بیگم اقدس کو سسرال لے جانا۔ اگرچہ کباب پٹھانوں کی مرغوب غذا ہے۔ لیکن کوئی غیر ملکی یا کمزور معدے کا شخص انھیں سونگھ بھی لے تو شاید یہ اُس کی زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ ہوگا۔ مگر پٹھانوں کی دلیری اور کھانے کی فطرت ثانیہ قابل داد ہے کہ وہ نہ صرف قیمہ سے بنے کباب بلکہ گائے بیل، بھینس اور بکریوں کا گوشت بھی ذوق وشوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں بعض پٹھان حضرات تو جانوروں کے مختلف سپیئر پارٹس بھی آنکھیں بند کر کے کھاتے ہیں۔ بطور خاص پر گائے کا گوشت کھانے میں اتنے ماہر اور رغبت سے کام لیتے ہیں کہ حلال جانوروں کی زبان تک کھا جاتے ہیں۔

''کباب'' کے معاملے میں ہمارے پٹھان لوگ بڑے جذباتی اور پُر جوش ہوتے ہیں۔ کبابوں کو دیکھتے ہی ان کو کھانے کا چسکا لگ جاتا ہے۔ پھر چاہے ''کباب'' آپ ان کو باقاعدہ ترتیب سے ڈشز میں پیش کریں یا اخبار میں پیش کریں۔ کھانے سے گریز نہیں کرتے۔ بقول شاعر:

کباب کے آنے سے دوستوں کے ایسے ہوش اُڑے
چائے پلیٹ میں ڈالی کباب پیالی میں

.....

ہمارے ہاں تو لوگ کباب کھانے کے اتنے عادی اور شوقین ہیں کہ اگر ''کباب'' نہ ہوں تو پھر بھی شعور اور تحت الشعور میں ہاتھ اور اُنگلیوں کے اشاروں سے عجیب وغریب حرکات کرتے ہیں۔ اور اگر ان ''کباب'' کے عادی حضرات کو آپ ''کباب'' سے نوازیں تو خوشی کے مارے سلیم صافی کی طرح عقل مندانہ، عائشہ گلالئی کی طرح دلیرانہ اور اداکارہ ریما کی طرح ماہرانہ باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست پروفیسر اسرار احمد کے مطابق جس نے ''کباب نہیں کھائے وہ پشتون تہذیب وثقافت سے ناواقف ہے''۔ بقول گل کاکا بعض لوگ تو کباب سنٹر پر گھٹنوں کھڑے ہوکر کباب کی لذیز خوشبو سونگھ سونگھ معدہ، دل ودماغ اور کھانے کی حس کو تسکین اور سکون پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کیفیت شاعر نے اس طرح بیان کی ہے:

کھانا تو بڑی چیز ہے اے جانِ تمنا
اس دل کی تسلی کو تیرا نام بہت ہے

.....

کبابوں کا ذکر کرتے کرتے منہ میں پانی بھر آنا ایک فطری عمل ہے، مگر اس دفعہ میں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ جب بھی موقع ملا تو لاہوری حلوہ پوری اور غازی بریانی کی طرح چپلی کباب کے ساتھ بھی انصاف کروں گا۔

آپ کا کیا ارادہ ہے.....؟؟

☆☆☆☆☆

کتنے موسم خواب ہوئے.....طارق بٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طارق بٹ کے ساتھ میری ملاقات آج سے کچھ ماہ قبل شاید مئی کے مہینے میں لاہور میں نوید صادق کے یہاں ہوئی۔ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میرا بالکل بھی دھیان نہیں گیا جب کتاب مجھے ملی۔ شاید میں نے تصویر پر غور نہیں کیا۔ میں بالکل بھی ٹیلی (telly) نہیں کر سکا اور بازیافت نہیں کر سکا کہ وہ یہی طارق بٹ ہیں، اگرچہ اس میں ایک مضمون نوید صادق کا موجود ہے۔ اس تلازمے سے بھی طارق بٹ صاحب تک نہیں پہنچا۔ لیکن شاعری کے ذریعے پہنچا۔ اس شاعری میں، جیسا کہ آپ کو پتا ہے کہ میں ذرا کوشش کرتا ہوں کھوٹ والی باتیں کم ہوں، مجھے مضامین کے اعتبار سے کوئی ایکسپشنل (exceptional)، بہت ایکسٹرا اوڈنری (extra oddnery) باتیں نہیں ملیں۔ لیکن یہ بھی ایک خوبی ہے اس کتاب کی، کہ ایک اچھے معیار کو شروع سے لے کر آخر تک قائم رکھا ہے۔ یعنی وہ جو ایک معیار ہے جو اچھا لگتا ہے اس میں کمی نہیں آئی۔ یعنی ایسا دکھائی نہیں دیتا ہے کہ اس ساری کتاب میں بھرتی کے شعر بھی جمع کر کے کتاب بنائی گئی ہو۔ ایک شغف، شاعر کا شاعری کے ساتھ جو ہے، اس پر جب غور کیا، کہ کوئی رشتہ اس کا کیا بنتا ہے اظہار کے ساتھ تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کی جو پہچان نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ زبان کے ساتھ لبرٹی لینا ہے۔۔ اچھا، اس بات میں ہو سکتا ہے کچھ سبجیکٹوزم میرا بھی ہو۔ اس لیے بھی مجھے پسند آئی ہو کہ میں نے بہت پہلے یہ جسارت کی تھی۔ تو مجھے ان کا یہ رویہ اچھا لگا۔ اور وہ بھی ایسا نہیں کہ انھوں نے تقلیدی انداز میں کوئی بات کی ہو یا پھر ڈفرنٹ (different) ہو کے دکھانے کے لیے یہ

جلیل عالی

بات کی ہو بلکہ یہ جو 'لسانی اختراع' ہے، وہ مصرعے کے اندر موزوں ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جو ایک تخلیقی اپروچ (approach) ہے وہ اس کا حصہ ہے۔

میں نے ظفر اقبال سے اختلاف کرتے ہوئے ایک بار یہ کہا تھا۔ (ہم اظہار الحق کے گھر بیٹھے ہوئے تھے کوئی بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے، وہ کہنے لگے میری جو لسانی اختراعات ہیں ان کے بارے میں کوئی بات کریں)

تو میں نے ان سے کہا: ''کہ وہ جو ایک سچ بولنے کی لت، آپ بزرگوں نے ہمیں لگائی ہوئی ہے۔ تو اس میں، میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ نے 'گل آفتاب' اور 'رطب و یابس' میں میکینکل (mechanical) کام کیا ہے، یہ آپ کے تخلیقی سیلف (self) کا کوئی نیچرل (natural) تقاضا نہیں تھا، اگر یہ نیچرل تقاضا ہوتا تو ان دونوں تجرباتی کتابوں کے بعد آپ کی ''عہد زیاں'' نہ آتی۔ کیونکہ ''عہدِ زیاں'' ''آبِ رواں'' سے بھی زیادہ روایتی زبان میں ہے۔ یعنی ''آبِ رواں'' میں تخلیقی زبان ہے مگر وہ جو ''عہد زیاں ہے'' (جو بھنوصاحب کا زمانہ تھا) تو اس میں سوشو پولیٹیکل کونٹینٹ (socio political content) زیادہ ہے۔ شعریت بھی ''آبِ رواں'' سے کم ہے۔

میرا خیال ہے میری ان باتوں کا کچھ تھوڑا سا اثر انھوں نے قبول بھی کیا اور اس کے بعد 'غبار آلود ستوں کا سراغ' میں ایک دو غزلوں میں تھوڑی سی اس طرح کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ ورنہ روز، ان کی غزل پڑھتے ہیں اور ان کے کلیات بھی آپ نے دیکھے ہیں، یہ بات کنٹینیو (continue) نہیں کر رہی۔ الٹا، آپ کو پتا ہے، وہ غالب و میر اور دیگر شاعروں کی بھی اظہار کی غلطیاں نکالتے رہتے ہیں... کہتے ہیں یہاں دیکھیں یہ تنافر ہو گیا ہے، یہاں دیکھیں زبان درست نہیں رہی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا تخلیقی اپٹیٹیوڈ (aptitude) وہ نہیں ہے جس کا انھیں دعویٰ ہے، تو یوں میں نے میکینکل (mechanical) کا لفظ بولا۔ تو خیر یہ ایک لمبی کہانی ہے۔۔۔ کسی نے میرا انٹرویو لیا تو اس میں انھوں نے ظفر اقبال کے بارے میں سوال کر لیا مجھ سے، تو میں نے کہا، ظفر اقبال ہمارے زندہ شاعروں میں غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں، مگر ان کی یہ عظمت جو ہے، ان کے پانچ فی صد کلام سے بنتی ہے اور باقی ان کا پچانوے فی صد کلام جو ہے مکینکل ہے۔ اس طرح سے کوئی ایک آدھ بات میں نے اور کر دی، تو ظفر اقبال صاحب نے دو کالم لکھے اور ان کے آٹھ پوائنٹ بنائے اور کہا کہ، عالی نے یہ کہا، یہ کہا ہے۔ اور جوابات دیئے اور آخر میں یہ کہا کہ عالی یہ کریڈٹ (credit) واپس لے لیں، جو کہتے ہیں کہ میں اس وقت غزل کا سب سے

بڑا شاعر ہوں۔ مجھ سے اخبار والوں نے کہا اگر آپ اس کا جواب دینا چاہتے ہیں تو ایک انٹرویو اور دے دیں۔ میں نے کہا نہیں --- مجھے خورشید رضوی صاحب نے بھی منع کیا کہ نہیں چھوڑیں بزرگ ہیں، اور میں عزت بھی بہت کرتا ہوں ظفر اقبال صاحب کی۔۔ ایسے ہی انھوں مجھے چھیڑا، تو میں نے کہا کہ میں نے ایک آدھ جملہ اور بول دیا تو انھوں نے پھر پورا کالم لکھنا ہے۔۔ ویسے میرے دل میں آیا کہ آج منیر نیازی زندہ ہوتے تو میں نے یہ کریڈٹ آپ کو دینا ہی نہیں تھا۔

خیر کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میری پہلی کتاب ''خواب دریچہ'' کے دیباچے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے یہ ذکر کیا ہوا ہے۔ کیونکہ میں بے اضافتی تراکیب بھی استعمال کرتا تھا اور حروف جار بھی حذف کرتا تھا۔۔۔

ان بارشوں سے پکنے لگی ہیں چھتیں مگر
صحنوں میں سایہ دار شجر جاگنے لگے

.....

احمد ندیم قاسمی صاحب نے لکھا، اگر عالی صاحب کی طرح آپ یہ تخلیقی اختراع کریں تو آپ کو نثری نظم کی بھول بھلیوں کی طرف نہ جانا پڑے۔ اس طرح کے جملے انھوں نے لکھے تھے۔

اب میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے 1967 میں بے اضافتی تراکیب اور حروف جار کے حذف کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، میں نے بالکل تخلیقی انداز میں feel کیا کہ اگر میں دریچہ خواب کہوں تو یہ ایک صوتی تاثر ہے۔ میں خواب دریچہ کہوں تو نہ صرف صوتی تاثر بدل جاتا ہے بلکہ اس کا کیفیاتی تاثر بھی بدل جاتا ہے۔ یہ میں نے شاعرانہ طور پر feel کیا۔ بعد میں میں نے خود بھی تجزیہ کیا، (کچھ غور و فکر کی عادت بھی تھی مجھے پڑی ہوئی)، کہ یہ چکر کیا ہے، ایسا کیوں ہے۔ تو مجھے لگا کہ یہ کوئی ادبی شریعت کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دونوں زبانوں کا جو آہنگ ہے وہ زیر کے ساتھ آپس میں جڑتا نہیں، لیکن اگر آپ زیر ہٹا دیں تو بعض اوقات وہ ہم آہنگ بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے نگرِ احساس کہیں تو آپ کو برا لگے گا، احساس نگر کہیں تو رواں ہو جائے گا، جیسے سمندرِ شوق کہیں (میری اپنی تراکیب ہیں) تو برا لگے گا۔ شوق سمندر کہیں تو ٹھیک لگے گا۔ پھر ہندی تراکیب تو ہندی زبان میں پہلے سے موجود ہیں، جیسے پریم نگر، پریت لڑی۔ پنجابی میں بھی جیسے ''دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو''

تو اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عروض میں کسی جگہ دریچہ خواب نہیں آ رہا تو وہاں ''خواب دریچہ'' لا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ فائدہ ہو گیا دوسرا لینگویج میں وسعت ہو گئی، کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ ایک ہی لفظ ہوتا ہے ڈکشنری میں، مگر شاعر جب اسے استعمال کرتا ہے تو کئی کئی کیفیات میں استعمال کرتا ہے۔ اس کے کئی شیڈز ہوتے ہیں، بہت سارے۔ اس سے ظاہر ہے ترکیب کے شیڈز میں بھی فرق پڑ گیا، اس میں اضافہ ہو گیا۔

اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ بے اضافتی تراکیب کے استعمال کی بنا پر میں طارق

بٹ کو اپنے قبیلے کا آدمی سمجھتا ہوں۔

شروع شروع میں لوگ بڑے تجسس پہ جبیں ہوئے تھے اور بڑے اعتراض بھی کرتے تھے، اس کے بعد پھر بزرگوں نے اور بعد والوں نے بھی یہ شروع کر دیا۔ آج یہ بات عجیب نہیں سمجھی جاتی، اسے نارمل لیا جاتا ہے، اور یہ زبان کا ایک پیرایۂ اظہار بن گیا ہے، زبان کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ اللہ میاں کا بہت کرم ہوا۔ تو طارق بٹ کے بے اضافتی تراکیب والے کچھ اشعار آپ بھی پڑھیے:

جو بھی ہوتا ہے کر دکھایا ہے
عشق مضموں کتاب میں کیا ہے

....

آن پہنچا ہوں سرِ منزلِ دل
سوچ گلیوں سے نکلتا ہوا میں

....

اب دیکھیں یہ بالکل الگ پڑی ہوئی تراکیب نہیں لگتیں، اچھا تو مجھے شروع شروع میں یہ فائدہ ہوا، وہ کہتے ہیں نا "بھلکھے جٹ کٹورا لبھا پانی پی پی آپھریا" تو میں نے محسوس کیا میری پہلی کتاب میں یہ کام کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔ اور اسے میں خود بھی feel کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ بعض اوقات اس میں کھردرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ تو پھر یہ لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ آپ جو بے اضافتی ترکیب برتیں، وہ پالش بھی ہو، اس کے کونے ہموار بھی ہوں۔۔ ہیرا تراشنا ہوتا ہے نا!، تو پھر میں نے دیکھا کہ بھی اگر دو لفظ ایک ہی صوت سے شروع ہونے والے ہوں، تو ترکیب اور بھی اچھی لگتی ہے۔ جیسے، 'خیال خانہ'، یا 'خوف خواب' طارق بٹ صاحب ہاں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے:

اس شب روز کی تگ و دو میں
دل دلاسہ بنا ہوا ہے کون

....

دل دریچہ ہے کون باغ کی سمت
ہے معطر مشام جاں اپنا

....

'دل دریچہ' کی بے اضافیت ترکیب تو میری اوائلی شاعری میں ہی سامنے آ گئی تھی۔

اب دوسرا کام ہوتا ہے مصدر سازی والا۔ اردو میں مصادر کی بہت کمی ہے اور خوش اسلوبی سے اگر مصادر بنائے جائیں تو زبان میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور اس کے اشتقاقات میں اضافہ ہوتا ہے، اس سے اور الفاظ بھی بنا سکتے ہیں:

دل ہی دل میں ہوئی ہیں سب باتیں
لب کو میں حرف آشنایا نہیں

....

بھید باہر کا اور بھیتر کا
دھیانا اور گیانا سارا

....

دل کی رفتار زلزلائی ہوئی
اپنے قدموں پہ ڈگمگائی ہوئی

....

تم نے دیکھے تو بہت ہوں گے، پہ کم کم ہیں غزال
جن کے غمزے مری غزلوں کو غزالے ہوئے ہیں

ابھی نسیم سحر صاحب اس شعر کی زمین کا ذکر کر کے گئے ہیں۔ اکثر اس طرح کے اتفاقات ہو جاتے ہیں، عرصہ ہوا میں نے اپنی طرف سے اور جنل زمین میں غزل کہی۔

اک ہمیں سلسلۂ شوق سنبھالے ہوئے ہیں
وہ تو سب عہدِ وفا حشر پہ ٹالے ہوئے

.....

جب میں نے غزل کہی تو کچھ دن بعد افتخار عارف صاحب نے بھی اس زمین میں غزل کہی، تو مشاعرے میں جہاں میں بھی موجود ہوتا غزل سنانے سے پہلے کہتے کہ میں نے جلیل عالی کی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ کچھ وقت گزرا تو توصیف تبسم صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ آپ کی زمین نہیں ہے یہ تو بھارت والے عرفان صدیقی کی زمین ہے۔ میں نے تحقیق کی تو پتا چلا وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تو پھر میں نے افتخار عارف صاحب کو منع کیا کہ میرا حوالہ نہ دیا کریں۔۔ اب یہ بات جو میں آپ کو بتانے والا ہوں، یہ اس لیے کرنی چاہیے کہ اس میں کسی کی عظمت کا پہلو نکلتا ہے۔ اسے پھیلانا چاہیے، اس سے دوسروں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ جب افتخار عارف صاحب کی یہ غزل رسالہ آثار میں چھپی تو یہ بات علم میں آنے کے باوجود انھوں نے اس کے نیچے بریکٹ میں لکھا کہ جلیل عالی اور عرفان صدیقی کی زمین میں۔۔ حالانکہ عرفان صدیقی کی زمین تھی، میری غزل تو انجانے میں اس زمین میں ہوئی تھی۔ اب چونکہ انھوں نے عرفان صدیقی کی غزل نہیں دیکھی تھی اور میری غزل پر غزل کہی تھی اس لیے اپنی دیانتداری قائم رکھتے ہوئے ''جلیل عالی اور عرفان صدیقی کی زمین میں'' کے الفاظ درج کرنا ضروری خیال کیا۔ اس بعد جب ان کا چوتھا مجموعہ کلام چھپا تو وہاں بھی انہوں نے یہ حوالہ دیا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بے شمار غزلیں دوسروں کی زمین میں، اساتذہ کی زمینوں میں، ایک ایک زمین میں بیسیوں غزلیں موجود ہیں، کبھی کسی نے حوالہ نہیں دیا کہ فلاں کی زمیں ہے، فلاں کی زمیں ہے۔ اب چونکہ ان کا ضمیر، ان سے یہ کہہ رہا تھا انھوں نے یہ غزل شعوری طور پر میری غزل دیکھ کر کہی تھی، اس لیے وہ اس خیال کو جھٹک نہیں سکے۔ اگر حوالہ نہ بھی دیتے تو فرق نہیں پڑنا تھا۔۔ تو یہ ایک بڑی تہذیبی بات ہے۔۔۔

پھر اس غزل پر کسی صاحب نے سیل فونی طرحی مشاعرہ کروا دیا جس میں اس پر کوئی ساٹھ ستر غزلیں ہو گئیں۔

اب بات کرتے ہیں اسم کو اسم صفت کی طرح استعمال کرنے کی۔ ان کا شعر ہے:

کب اچھالے گا کوئی موج محبت والی
جو سمندر کرے اس درد کی دریائی کو

.....

یہاں دریا سے دریائی اسم صفت بن گیا۔۔ ایک اور شعر دیکھیں:

کسرِ شاں ہم سے گر گدائی ہوئی
آپ سے بھی نہ میرزائی ہوئی

.....

مرزا سے میرزائی اسم صفت بنا لیا۔ اسی طرح :

موج دریا بھی گم ہوا بھی چپ
کس بہاؤ ہے بادبانی مری
بادبان سے بادبانی۔
تو جناب طارق صاحب جہاں حروف جار کو حذف کرتے ہیں اس کی بھی کچھ مثالیں دیکھئے۔
ایک اک سر کی سادھنا کرتے
دل نے کس راگ تجھ کو گایا نہیں

.....

کس راگ (سے) یا کس راگ (میں)

.....

تو کہ نشتر زنی پہ آمادہ
خار تک میں کبھی چبھویا نہیں

.....

اب یہ پنجابی کا اسٹائل ہے نا (میں لاہور جانا ایں) پنجابی میں 'نے' نہیں لگاتے۔
نہ جانے کونسی منزل شکار ہو جائیں
کہ آگے راہ میں کیا کیا مچان پڑتا ہے

.....

کون سی منزل پر شکار ہو جائیں سے پر حذف کر دیا

.....

کچھ مجتمع نہیں ہیں سرابوں کے کارواں
بکھرے پڑے ہیں خواب بھی، دھوپوں سڑے ہوئے

.....

دھوپ کے اندر سڑے ہوئے، دھوپوں میں سڑے ہوئے یا دھوپوں سے سڑے ہوئے۔ تو 'سے' حذف کیا ہوا ہے۔
ابھی نعیم صاحب نے آپ کی پنجابی غزل پڑھی۔ آپ پنجابی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور بڑی سہولت کے ساتھ، اس میں ایسا نہیں لگتا کہ زبردستی کی گئی ہو۔
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
ایسا سنتے تھے ایسا ہویا نئیں

.....

نقش تیرا میں جاں سے دھویا نئیں
خود پہ رویا ہوں، تجھ کو رویا نئیں

.....

بات وہ جس پہ دل ٹھہر جائے
اور کیا ہے گا استخارے میں
(ہے گا)،
عمر گئی ہے، آس امیدیں گود لیے
آج بھی ان میں کوئی بیاہنے جوگ نہیں

.....

'بیاہنے جوگ' یہ پنجابی کا ایکسپریشن ہے۔ بیاہنے کے لائق۔
زخم ہے، خود ہی کہیں
اور کہیں، پھایا ہے دل

.....

کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کے آخر میں کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کچھ عروض کی غلطیاں ہیں اور کچھ عروض کی غلطیاں نہیں ہیں۔ لیکن یہ کتاب ایسی ہے، جس کے بارے میں ہم کہیں گے اس میں جو عروض کی غلطیاں نہیں ہیں وہ بھی بہت کم ہیں اور کتابت کی غلطیاں بھی کم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں ایک آدھ اشارہ ضرور کر دوں۔
ان کا ایک مصرع ہے:

چشم و دامانِ دل و دستِ دعا۔۔

اس طرح واؤ کا استعمال نہیں ہوتا، یعنی اس طرح سے واؤ الگ بولنا۔ آپ اگر یہی کر لیں 'چشم دامانِ دل و دست دعا' تو اس سے وہ نہیں ہونا تھا (یہ چاروں ایک ہیں والی بات نہیں)۔ یہ مصرع ایسے بھی ٹھیک ہے:

کہا تھا ، نہ کر دل کو صرف تماشا
کہا تھا ناں ، ہاتھوں سے جاتا رہے گا

.....

دوسرے مصرعے میں جو (ناں) ہے، وہ (سمجھ گیا ایں ناں) والا استعمال کیا گیا ہے مگر پہلے مصرعے میں تو 'نہ' نہیں والا ہے۔ اب اس کا وزن ہو گیا نون الف 'نا'۔ لیکن یہاں 'نہ' سے زیادہ کچھ نہیں آنا۔ الف بھی زیادہ ہو جائے گا:

اک ترا دھیان ہے دشا اپنی
ہم نئی منزلوں کے جویا نہیں

.....

یہ جو لفظ 'جویا' ہے اس کا تلفظ 'جُویا' ہے۔ اس حوالے سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا، اس کا کوئی تعلق اس شعر سے نہیں۔

ہم جب ایم اے اردو میں پڑھتے تھے، تو ہمارے ساتھ ایک لڑکا تھا، فرسٹ ایئر میں، ایک دفعہ کسی نے اس سے پوچھا کہ دیوانِ غالب کس نے لکھا ہے، تو اس کے منہ سے اک دم نکل گیا، ''الطاف حسین حالی نے''۔ اُس کا نام تھا 'جوئیہ' تو اس پر ہم نے بے ساختہ نعرہ لگایا۔ ''ہا ہا جوئیہ'' تو اب وہ 'ہا ہا جوئیہ' ہوسٹل کا نعرہ بن گیا۔ جب بھی صبح اٹھتے شیو کرنے جاتے تو زور زور سے لمبی ہا کے ساتھ جوئیہ کا نعرہ لگاتے۔ ان دنوں گول باغ لاہور میں بھٹو صاحب کا ایک جلسہ تھا تو بھٹو صاحب کے نعرے لگ رہے تھے جلسے میں۔ ایک طرف ہم طلبہ کا گروپ کھڑا تھا۔ تو ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد ''ہا جوئیہ''، ''ہا جوئیہ'' کے نعرے لگاتے۔ اس پر بھٹو صاحب نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ جوئیہ کون ہے؟ ان کو شاید خیال ہوا کہ اس نام کا کوئی شخص ان کے مقابلے میں کھڑا ہے۔

مگر یہاں شعر میں 'جُویا' درست تلفظ کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔

اچھا ایک اور بات ہے، وہ آپ ہی نہیں کرتے، سارے کرتے ہیں لیکن میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ وہ چاہے غالب ہی کیوں نہ ہوں۔ دیکھیں قافیے کی بنیاد صوت ہے شکل نہیں، یعنی 'بھید' کا لفظ 'خورشید' اور دید کا ہم قافیہ نہیں ہو سکتا۔ ایک غزل میں سارے قافیے ایک صوت میں آنے چاہئیں۔ غالب کی وہ غزل جو 'بھید' والی ہے 'خورشید' والی ہے، نہ بھید میں سارے قافیے آتے ہیں نہ 'خورشید' میں۔ لہٰذا بلائنڈ کارنر بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی ہو سکتا ہے، اس سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہو جاتا۔ اگر ایک بچہ بھی بتا دے کہ ابو'' آپ کی مونچھوں میں کچھ اٹکا ہوا ہے'' تو کوئی حرج نہیں، حقیقت تو حقیقت ہے۔ اسی طرح صحرا، اکہرا، بہرہ کا قافیہ 'چہرہ' درست نہیں۔ چونکہ

صوت وہ نہیں آ رہی، اس طریقہ سے 'نچوڑ' اور 'نچوڑ' کا قافیہ تو 'لاہور' ہو سکتا ہے، مگر آپ 'موڑ' یا 'شور' کا قافیہ لاہور نہیں لا سکتے- لوگ لاتے ہیں مگر میری رائے میں درست نہیں ہے-

اچھا یہ مجھے بتائیں! میں اپنی اصلاح چاہتا ہوں آپ نے ایک مصرعے میں 'خطِ مماس' باندھا ہے، میم پر شد لگائی ہوئی ہے، میں نے کل عربی کی ڈکشنری بھی دیکھی اپنی تصحیح کے لیے، فرہنگ عامرہ بھی دیکھی، یہ لفظ تشدید کے بغیر ہے- کیونکہ آپ نے بطور خاص اسے شد کے ساتھ استعمال کیا تو میں ڈانواں ڈول ہو گیا-

اب آخر میں مجھے جو شعر پسند آئے، سارے تو نہیں لکھ سکا، کچھ شعر ان میں سے آپ کی نذر ضرور کرنا چاہتا ہوں- بہت کم ایسے شعر ہوتے ہیں، یعنی بطور کریٹیوٹی (creativity) جو پورے خیال اور پورے شعر کا اسٹرکچر (structure) اور پھر اس میں امیجز (mages) اور جو نکات وہ بناتے ہیں، وہ ساری چیزیں ملا کر جو شعر آپ کے ذوق کو ٹچ کرتا ہے- شعر دیکھیے:

کیا بگولے سا سرِ دشت اڑاتا ہے غبار---

پہلے یہ مصرع ہی دیکھ لیں:

کیا بگولے سا سرِ دشت اڑاتا ہے غبار
آ بھرے شہر میں لا، شوق کی رسوائی کو

طارق صاحب میں خود بھی کبھی کبھی اپنی شاعری میں سے شعر منتخب کرتا ہوں اور اپنے آپ کو سناتا ہوں، اور پھر پوچھتا ہوں، "یار! یہ تم نے کہے ہوئے ہیں"- جب میں 'فنون' کا قاری تھا، اس میں چھپتا بھی تھا--- کبھی دل چسپی سے کوئی محقق آئے میری لائبریری میں تو دیکھے، میں حصۂ شاعری میں اپنے پسندیدہ شعروں پر نشان لگاتا تھا، تو فنون کے کئی شمارے آپ کو ایسے ملیں گے جس میں میری اپنی غزل پر ایک بھی نشان نہیں ملے گا، بعض ایسے ملیں گے جن میں دوسروں کی غزل پر دو دو، تین تین نشان ملیں گے اور میرے صرف ایک نشان ہوگا- تو اس سے آپ کے معیارِ شعر کا پتا چلتا ہے، تنقیدی معیار جو ہے اس کا پتا چلتا ہے، اگر کسی نے اپنا معیارِ شعر جو ہے، ریفائنڈ رکھا ہوا ہے، سبلائم (sublime) رکھا ہوا ہے اور دیکھیں غالب نے اپنا وہ شعر جو ایک چھوٹے سے سقم کی وجہ سے رد کر دیا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو 'پا پایا' کے تنافر کے سبب نکال دیا- اب دیکھیں کتنے بڑے بڑے لوگوں سے کیسی غلطی ہو سکتی ہے- آج ہمیں پتا چل رہا ہے کہ وہ شعر نہ صرف غالب کے اچھے اشعار میں شامل ہے بلکہ اردو شاعری کے چند منتخب شعروں میں ہی نہیں پوری دنیا کی شاعری کا جو انتخاب ہے، اُس لیول پر جا کر شامل ہے-

اور اشعار دیکھیے:-

سبزہ اُگنے لگا ہے رستوں پر
کوئی آیا گیا نہ مدت سے

کیا عمدہ شعر ہے:

سوئے افلاک اڑا جاتا ہوں
خواب پر خواب بدلتا ہوا میں

....

یہ خواب پر خواب بدلتا اور سوئے افلاک اڑنا پر، مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا، وہ غالب کا ایک شعر جو ہے نہ:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

....

تو غالب نے یوں سمجھیے اسے افقی انداز سے رکھا ہوا تھا، تو میں نے اسے عمودی کر دیا۔

آسماں جانے کہاں لے کے چلا ہے مجھ کو
اوپر اٹھتا ہے برابر مری پرواز کے ساتھ

....

سوئے افلاک اڑا جاتا ہوں
خواب پر خواب بدلتا ہوا میں

....

دیکھ یہ مجھ میں اترتا ہوا تو
دیکھ یہ تجھ میں بدلتا ہوا میں

شعر دیکھیے:

بیچ دریا جو ہے ہم، تو کھلا
تھے عبث مبتلا، کنارے میں

....

یہ کنارے میں مبتلا ہونا نئی بات ہے، اس کے ذریعے انھوں نے کتنی بلیغ بات کہہ دی ہے۔ آسودگی میں مطمئن ہونا، مبتلا کنارے میں ہونا۔

الجھتی ہے کہیں سینے میں سانس کی ڈوری
عجیب سایہ سا کچھ، دل پہ آن پڑتا ہے

....

لمحہ لمحہ، گنا نہیں ہے وقت
لمحہ لمحہ اسے کمایا ہے

....

پڑھوں کیا اس حیاتِ مختصر میں
لکھا وہ اس قدر تفصیل میں ہے

....

اجڑا ہے جس کا باغ، نظر بھر ادھر بھی دیکھ
گنتا ہے، اپنی شاخ کے پتے، جھڑے ہوئے

....

ہمیں بھی تجھ سا تغافل شعار بننا تھا
یہ بات کاش نہ ہوتی، مگر یہ ہو گئی ہے

....

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
ایسا سنتے تھے ایسا ہوا نہیں

....

اچھا جناب! یہ کچھ ایسے ایکسپشنل اشعار ہیں جو قدرت عطا کرتی ہے، یہ اس کی طرف سے بڑی نعمت ہے۔ اور اس کا کفران بھی نہیں کرنا چاہیے، اور اپنے ایسے اشعار پر زیادہ سے زیادہ غور کرنا چاہیے، تا کہ آپ کو پتا چلے، آپ خود اپنے لیے کہاں کہاں چیلنج ہیں۔

☆☆☆☆☆

عامر عبداللہ کی نظم نگاری، ایک اجمالی جائزہ

ادب کے میدان میں عامر عبداللہ کا تعلق نئی نسل سے ہے لیکن جب اُن کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اُن کے قلم کے نطق سے نکلی ہوئی ہر تحریر ان کی عمر کے ماہ و سال کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ خاص طور پر ان کی نظم میں جو پختگی اور سلیقگی اُمڈتی ہوئی نظر آتی ہے ان کی نسل کے دوسرے شعرا میں خال خال ہی ملتی ہے۔ جب میں اُن کی نظموں کی پہلی کتاب ''میں تنہا کھڑا ہوں'' میں اُترا تو مجھے ان کی نظم نگاری میں بہت سی خوبیاں دیکھنے کو ملیں۔ پہلی خوبی جس نے مجھے متاثر کیا نظم کا وہ بہاؤ ہے، جو اپنے پورے ردھم اور پوری موسیقیت کو ہمراہ لیے ہوئے نظم کے انجام تک آہستہ خرامی سے آگے بڑھتا ہے۔ ان کی یہ خوبی قاری کو سحر زدہ کیے رکھتی ہے اور یہی سحر زدگی اُسے نظم کے مفاہیم تک رسائی کے لیے اُکساتی ہے۔

دوسرے عامر نے اپنی نظموں میں جتنے بھی سمبلز برتے ہیں وہ ہر قسم کے الجھاؤ سے مبرا ہیں۔ جب کوئی شاعر ایسے بولتے ہوئے سمبلز کو اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے تو قاری کسی صورت بھی ان کی شاعری سے دور نہیں بھاگتا۔ عامر عبداللہ ایسے ہی سمبلز کو اپنی نظم میں سمو کر قاری کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اُن کی اکثر نظموں میں کہانی کا سا انداز ملتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی نظموں میں اُس بکھراؤ کا شائبہ تک نہیں ملتا جس کا اکثر شعرا شکار ہو جاتے ہیں۔

عامر عبداللہ کی اس کتاب کو پڑھ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہ کچھ نظموں میں مایوسی کا شکار ہو گیا ہو۔ یہ نظمیں بھلے ہی فنی نقطہ نگاہ سے بلند ہوں گی لیکن اُن میں جو یاسیت در آئی ہے اُس نے انھیں قدرے دھندلا کے رکھ دیا ہے۔ لیکن جن نظموں میں رجائیت رچی بسی دکھائی دیتی ہے۔ اُن میں پھوٹتی امید کی کرن نے یاسیت کے سایوں کو بہت حد تک دور کرنے کی سعی کی ہے۔

حنیف باوا

عامر عبداللہ کی یہ پہلی کتاب ہے لیکن اُن کی اس پہلی کوشش نے بھی اردو ادب کا ذوق رکھنے والوں سے شناسائی حاصل کر لی ہے۔ شاعری میں عامر نے صرف نظم نگاری پر ہی اکتفا نہیں کیا اُس نے غزلیں بھی پورے انہماک سے لکھیں ہیں۔ جب بھی مجھے اُن کی غزل پڑھنے کا اتفاق ہوا تو مجھے وہ اپنے ہم عصروں سے کچھ فاصلے پر کھڑا دکھائی دیا۔ میرا کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اُس نے صنف غزل میں کوئی نئے تجربے کرنے کی سعی کرتے ہوئے اُس کی فنی تقاضوں میں کچھ رخنہ اندازی کی ہے۔ اُس نے غزل کہتے وقت ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ اس نے غزل میں کچھ نیا لانے کی کوشش کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس کے ہاں غزل میں مضامین باندھنے کا ایک الگ انداز ہے۔ اُس نے بھاری تراکیب سے کنارہ کشی اختیار کر کے غزل کو سہلِ ممتنع کی راہ پر ڈالا ہے۔ کہتے ہیں خود کو یا یوں کہہ لیجئے کہ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے میرا اور ناصر کاظمی کی اختیار کردہ راہوں پر خود کو اُن کے ہم رکاب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہے یہ تو کوئی نقاد ہی بتا سکتا ہے۔

آجکل اُردو کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی نظم نگاری کا رُخ انگریزی کی طرف موڑ لیا ہے۔ اس میں وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُن کی کئی نظمیں بدیس میں شائع ہونے والے انگریزی نظموں کے انتخابات میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکی ہیں اور مجھے امید ہے کہ اگر ان کا قلم اسی طرح رواں رہا تو وہ انگریزی نظم نگاری میں بہت آگے تک جائے گا۔

انھوں نے اپنی مادری زبان سے بھی اغماض نہیں برتا۔ اس میں انھوں نے پنجابی زبان کی کوکھ سے جنم لینے والی صنف ماہیا کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے ماہیوں میں رومانس کے روایتی لوزامات کے علاوہ کچھ معاشرتی اور معاشی حالات کو اس خوبصورتی سے سمویا گیا ہے کہ کیا کہنے ایسا کرتے ہوئے انھوں نے ماہیے کی دیرینہ ہیئت میں رتی بھر بھی فرق نہیں آنے دیا۔ اس طرح پہلا مصرع بے معنی اور دوسرے دو مصرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور بامقصد لیکن اردو میں آجکل جو ماہیا لکھا جا رہا اُس میں پہلا مصرع بھی معنی کے لحاظ سے اگلے دو مصرعوں سے جڑا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو کہ ماہیے کے فن میں یہ بدلاؤ کسی طور پر جائز نہیں۔

☆☆☆☆☆

سیّدہ تسنیم بخاری کی کتاب ''ہیر اور مَیں''

سیّدہ تسنیم بخاری سے میری شناسائی کو کوئی ایک عشرہ ہوا۔ کچھ مشاعروں کے دوران میں اُس نے اپنی باری آنے سے قبل مجھے اپنا کلام دکھایا، بلکہ ایک دو مرتبہ تو اُس نے اپنی ساری بیاض ہی میرے سپرد کر دی کہ میں اُسے کوئی اچھی غزل منتخب کر کے دوں، مگر سچی بات ہے، اُن دنوں اُس کے کلام میں کچھ ایسے مسائل تھے جو فوری اصلاح سے حل نہ ہو سکتے تھے اور مشاعرے کے ہنگامی ماحول میں تو ایسا ہونا مزید محال تھا، تاہم جیسے تیسے مَیں نے اُسے کچھ اشعار منتخب کر کے اور ممکنہ حد تک باوزن کر کے پڑھنے کے لیے دے دیئے۔ ظاہر ہے، اُن دنوں اگر اسے نوآموز شاعرہ کہا جاتا تو کسی حد تک درست ہوتا۔

مگر اب یہ پُرانی بات ہو چکی ہے اور اس عرصے میں تسنیم بخاری نے شاعری کے فنی رموز، عروض و بحور سے قابلِ رشک حد تک آگاہی حاصل کر لی ہے، اس کے جنون اور اس کی ریاضت نے اس کے ارتقائی عمل میں ایسی تیز رفتاری پیدا کی ہے اور شاعری سے اُس کی کمٹ منٹ نے اُسے تخلیقی سفر میں کچھ اتنا مصروف رکھا کہ اُس نے اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود اپنے بہت سے ماہ و سال اپنے شعری جنون کی نذر کر دیئے۔ بے شمار اچھے اچھے شاعروں کی صحبت میں بیٹھ کر اور ادبی مجلسوں سے فیض یاب ہو کر اس نے بالآخر اپنا ایک الگ اسلوب اور منفرد تخلیقی دائرہ قائم کر لیا۔ اب مجھے اس کی شاعری پڑھ کر اور مشاعروں میں اس کی شاعری سنانے کا دل نشیں شاعرانہ انداز دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ اگرچہ اپنی فطری عالی ظرفی کے تحت وہ اب بھی اعلانیہ یہی کہتی ہے کہ یہ پودا میں نے لگایا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ شاعری کا یہ پودا تو اُس کے اندر بہت پہلے کہیں اُگ چکا تھا، میں نے اُسے صرف اپنی محدود استطاعت کے مطابق سینچا، تھوڑی بہت رہنمائی دی اور بس!

اب جب کافی عرصے کے بعد اس کا مجموعۂ کلام ''ہیر اور مَیں'' کی صورت میں سامنے آ رہا ہے تو مجھے اتنی مسرت ہو رہی ہے جو بیان سے باہر ہے، اس میں بقول اُس کے اگر میرا کوئی ہاتھ ہے تو میں اس پر متفخر بھی ہوں اور اس کا شکر گزار بھی کہ اس نے میری معمولی سی رہنمائی کو یاد رکھا اور مجھے اس آیت کی یاد دلا دی کہ ''ھل جزاء الاحسان اِلّا الاحسان'' ۔اس کے ارتقائی سفر کا مَیں عینی گواہ بھی ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے جمالیاتی دل و ذہن کی خوبصورتیوں کو کس عمدگی کے ساتھ اشعار میں ڈھال رہی ہے، اور بتدریج اس کے موضوعات میں وہ پھیلاؤ بھی آ رہا ہے جو عموماً کسی شاعر یا شاعرہ کو کئی عشروں کے بعد نصیب ہوا کرتا ہے۔ مصرعہ سازی اور سہلِ ممتنع میں شعر کہنے کی خوبی نے اس کی شاعری کا ابلاغ مزید سہل، وسیع اور مقبول بنا دیا ہے۔ شاید اس کی وہ دعائیں قبول ہوئیں جو اس شعر میں بیان کی گئی ہیں:

راستہ روک مت دعاؤں کا
جانبِ آسمان جانے دے

نسیمِ سحر

سیدہ تسلیم بخاری کی اس مجموعے میں شامل تمام غزلیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ مختصر بحر میں اپنا اظہار کامیابی کے ساتھ کرتی ہے اور اس کی زیادہ تر غزلیں غزلِ مسلسل کے انداز میں ہیں، غزل گوئی میں غزل کے ہر شعر کو منفرد معنی دینے کی نسبت ایک ہی موضوع پر کہنا اور یوں ہر شعر کو غزلِ مسلسل کی لڑی میں پرو دینا ایک تخلیقی ریاضت اور مہارت کے بغیر میسّر نہیں آتا۔ پھر اُس کی اکثر غزلیں پانچ یا چھ سات اشعار پر مشتمل ہیں جس کا مطلب ہے وہ بلاوجہ غزل میں بھرتی کے اشعار ڈال کر اسے طول دینے کی قائل نہیں بلکہ جہاں تک اس کی تخلیقی زرخیزی ساتھ دیتی ہے غزل کو وہیں مکمل کر دیتی ہے۔ اس کی اچھوتی ردیفوں نے بھی اس کی غزلوں میں ایک دلکشی پیدا کر دی ہے، اسی طرح کہیں کہیں عمدہ لفظی تراکیب اور رعایتِ لفظی کا استعمال بھی شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔

یہ تمام کیفیات تسلیم بخاری کے کئی اشعار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میرے ذوقِ شعری کی تسکین کا باعث بنی ہیں، اس لیے میں قارئین کو بھی اس کیف اور اس کیفیت میں شامل کرنے کے لیے اس کے چند اشعار یہاں لکھ رہا ہوں:

لمس کی نازکی سلگتی ہے
خواہش خوشگوار سے باہر

تم نے دیکھا خزاں کے موسم میں
درد کی داستاں سناتے پھول

ایک دو پل کے وصل کا قصہ
ہجر کا راستہ سمجھتی ہوں

خواب میں بھی مجھے ڈراتے ہیں
رات کا وقت اور گلی سنسان

میری صورت بنا کے مٹی سے
پھر اسے بارشوں میں چھوڑ دیا

دل کے صحرا میں پیاس کی بہتات
اور میں برسات سے نہیں نکلی

کٹ گئی عمر ہجر میں لیکن
تیری بانہوں میں کٹ گئی ہوتی

ممکن ہے دھوپ سے نہ کبھی جنگ کر سکے
بوڑھے شجر کے سائے میں سویا ہوا وجود

پیاس ہونٹوں پہ رقص کرنے لگی
اور خالی پڑا گلاس ابھی

پیرہن چیتھڑے ہوا تسلیم
کھیت میں ہے کھڑی کپاس ابھی

سبز باغات سے نکل آئی
میں خرافات سے نکل آئی

مَیں سیدہ تسلیم بخاری کے اس خوبصورت تخلیقی مجموعے کی اشاعت پر اظہارِ مسرّت کرتے اور اُسے مبارک باد کہتے ہوئے مقطع کے طور پر صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں شامل تسلیم بخاری کی غزلوں میں مجھے بیر تو کم کم ہی دکھائی دی ہے مگر مَیں، یعنی تسلیم بخاری اپنے پورے وجود کی رعنائی اور جمالیاتی اسلوب کے ساتھ ہر شعر میں جگمگاتی اور گنگناتی نظر آ رہی ہے اور یہی ایک تخلیقی شاعر یا شاعرہ کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعروں میں موجود بھی رہے اور دکھائی بھی دے۔

☆☆☆☆☆

باعث تحریر آنکہ

(بیاض فروری-2024 شاہ داستان- علی پور کا ایلی اور گوریلی)

مدتوں سے بیاض کھولتے ہی ''شاہ داستان'' سے گزرتا ہوں- اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اچھا جملہ میری کمزوری ہے- دِل سے داد میں اچھے جملے یا اچھے شعر ہی کی دیتا ہوں- ماڑے شعر پر شور وغوغا اٹھاتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے- شاید یار لوگ یہ نہیں چاہتے کہ یہ بندہ محنت کرے اور آگے بڑھے- کیا وہ یہ چاہتے ہوں کہ داد وتحسین کے نشے میں یہ بندہ یہیں اٹکا رہے- دِلوں کے بھید خلق کرنے والا ہی جانتا ہے- ہم تو اٹکل پچو ہی لگا سکتے ہیں- بیاض فروری 2024 میں مضمون'' شاہ داستان'' کے چند جملوں کا لطف لیجیے-

☆.....یہ سننا تھا کہ غلام دستگیر خان کا پارا چڑھ گیا- نہایت غصّے سے بولے'' آپ کون ہوتے ہیں مجھے مشورہ دینے والے- میں سیاسی آدمی ہوں، ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے- میرے ہارنے سے کون سا آسمان گر پڑے گا آپ کی بزدلی نے تو مجھے ہارنے سے پہلے ہرا دیا ہے''.....صفحہ 220

☆.....اُن (حامد ناصر چٹھہ) کی باتیں سن کر کچھ یوں گمان ہوا جیسے اُنھیں دُہرا افسوس ہوا ہے- آصف نواز کے گزر جانے کا.....اور نواز شریف کے بچ جانے کا.....صفحہ 221

☆.....اکثر لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص کلرک تھا اَب وزیر ہو گیا ہے- ہر کلرک وزیر نہیں بنتا -اس کے لیے غیر معمولی ذہانت، چالاکی اَور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے- اس طرح کے کچھ لوگ اپنے ماضی کو دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ ایاز کی طرح اسے سنبھال کر رکھتے ہیں.....صفحہ 221

☆.....لارڈ میکالے نے جہاں اہلِ ہند کو قانون دیا تھا وہاں اس کی زَد سے بچنے کے طور طریقے بھی سکھا دئے تھے.....صفحہ 222

۲۰۰۹ء میں وطن واپسی کے بعد خالد احمد کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا- کم وبیش ہر ملاقات پر خالد احمد مجھ سے میرے پوسٹل ایڈریس کا تقاضا کرتا اور میں آئیں بائیں شائیں کر جاتا- شفیق سلیمی پوچھتا'' تم خالد احمد کو اپنا ایڈریس

اسلام عظمی

دے کیوں نہیں دیتے!'' بات یہ تھی کہ بیاض میں پڑھ ہی لیتا تھا۔ میں ''ایویں ای یار'' کہہ کر میں بات ٹال جاتا۔ خالد احمد کا اصرار جاری رہا تو دو ڈھائی برس کے بعد میں نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنا پوسٹل ایڈریس خالد احمد کو دے دیا۔ تب سے بیاض کا اعزازی پرچا مجھے باقاعدگی سے تاحال مل رہا ہے۔ بیاض ہاتھ آتا ہے تو اچھے جملوں کی تلاش میں ''شاہ داستان'' سے گزرتا ہوں۔

امجد اسلام امجد کہا کرتا تھا: ''اس ڈر سے اچھا جملہ ضائع مت کرو کہ کوئی اس کی زد میں آجائے گا۔ بندہ مرتا ہے تو مرجانے دو، جملہ ضائع مت کرو۔'' کیا وقت تھا اور کیا کیا لوگ تھے۔ یاد دریچہ کھلتا ہے تو کتنے ہی چہرے آنکھوں کے سامنے آجاتے اور جھلک دکھا کر پھر چھپ جاتے ہیں۔ زندگی کا سفر مگر جاری و ساری رہتا ہے۔

1989 میں دوحا کے عالمی مشاعرے کے بعد ایک قطری وزیر نے پاکستانی شعرا کی عزت افزائی کے لیے اپنے فارم ہاؤس پر دعوت کا اہتمام کیا۔ مجلس ہال خوب کشادہ تھا۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے بار بار دروازے تک آنے کی زحمت سے بچنے کے لیے، بوڑھے وزیر نے دروازے کے ساتھ ہی نشست سنبھال لی تھی۔ وہ سادہ بندہ تھا، نام نمود سے مبرا۔ اُس سے ملنے کے بعد امجد اسلام امجد نے اپنی نشست سنبھالتے ہی ساتھ بیٹھے شخص کے کان میں سرگوشی کی۔ ''فلاں بندے کا بھلا ہو۔ اُس نے مجلس میں داخلے سے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ جنابِ وزیر دروازے کے پاس بیٹھے ہیں۔ مجھے اِس بات کا علم نہ ہوتا تو شاید میں بطور بخشیش ایک سکّہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔''

دوحہ قطر میں گھریلو دعوتیں معمول کی بات تھیں۔ چھٹی کے روز کسی نہ کسی دعوت میں پاک و ہند کے لکھاریوں اکٹھے ہو جاتے اور مشاعرہ سرزد ہو جاتا۔ کھانے کے دوران، میں اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے لگتا تو شمیم جونپوری مجھے حیرت سے مجھے گھورتا۔ کئی مہینوں تک ایسا چلتا رہا، پھر میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔

''میاں، ایسا کیوں!''..... شمیم جونپوری قدرے جھینپے اور بولے ''بھائی ہمارے ہاں دعوتوں میں کھانے کا آغاز سالن روٹی سے کیا جاتا ہے مگر آپ ہر بار اپنا ہاتھ بریانی کی طرف ہی کیوں بڑھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایسا کرنا بدتہذیبی ہے۔''

مجھے ہنسی آگئی۔ میں جانتا تھا کہ جنوبی ہند میں مچھلی چاول کا دامن چولی کا ساتھ ہے۔ بعض جگہ تو دوپہر میں ''مچھلی چاول'' اور رات میں ''چاول مچھلی'' کا دستور ہے۔ میں نے عرض کیا۔

''جونپوری بھائی، اِتنا کشٹ کاہے کو اُٹھایا۔ پہلے پوچھ لیتے اور میں بتا دیتا تو آپ اِس حیرانی سے بچ جاتے۔ پنجابی خوراک میں

روٹی اہم ہے۔ جبھی مہمان کو بولتے ہیں ''روٹی شوٹی کھا کے جاؤ۔'' کوئی یہ نہیں کہتا کہ دال چاول کھا کے جاؤ۔ بھوک کم ہو یا زیادہ کھانے والے کا ہاتھ کم دستیاب شے کی طرف ہی بڑھتا ہے۔''

''شاہ داستان'' سے گزر کر پلٹا تو ممتاز مفتی کے مضمون ''گوریلی'' پر نظر پڑ گئی۔ ممتاز مفتی ''چھڑ یار'' ٹولی میں قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد کے ساتھی تھے۔ ممتاز مفتی کے ناول (یا پھر سرگزشت) ''علی پور کا ایلی'' مطالعہ میں پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کے آغاز میں کالج کے دنوں میں کر چکا تھا۔ علی پور کا ایلی یقیناً دکھری طرز کی تحریر تھی۔ مشتاق یوسفی کہیں یہ لکھا ہے کہ سردی روئی سے جاتی ہے یا دوئی سے۔ دوئی میسر نہ ہو اور رضائی پتلی تو عصمت چغتائی کا ''لحاف'' اوڑھ کر سو جائیں۔'' ممتاز مفتی کے بارے میں قدرت اللہ شہاب کا فتویٰ تھا ''مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرائم پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشعور اُس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے محمد خاں اور بھوپت ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔''

اتفاق کی بات ہے کہ ''علی پور کا ایلی'' اَب بھی میری لائبریری میں موجود ہے۔ اِس میں سے چند اقتباسات آپ بھی دیکھیں۔

☆..... ''صفیہ کا اتنا بڑا گورا چٹا چوڑا چہرہ دیکھ کر وہ پھر نگاہیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اس کی نگاہیں صفیہ کی ململ کی قمیص پر پھسل آتیں۔ ململ کی سفید قمیص دیکھ کر دفعتاً اسے خیال آتا کہ کہیں قریب ہی سے وہ ابھری ہوئی ہے''..... صفحہ 22

☆..... ''کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ شیخ عظمت بیگ کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کونسا بے نظیر نسخہ ہے جو تنکوں کے حساب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ راز فاش کرتا کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی بیوی کی آنکھیں اتنی متکلم کیوں ہیں..... صفحہ 25

☆..... ''اُدھر جانو جب سے شہزاد کے پاس آئی تھی اُس کی یوں رکھوالی کرنے لگی تھی جیسے شریف کی ایجنٹ ہو اور شہزاد کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے متعین کی گئی ہو''..... صفحہ 384

1282 صفحات پر مشتمل ''علی پور کا ایلی'' کا خال ہی کوئی صفحہ ہو جو کسی ایسے جملے سے خالی ہو جو رُکنے پر مجبور نہ کر دے۔ جملوں کی کاٹ شوکت علی شاہ اور ممتاز مفتی دونوں کے پاس ہے مگر میدان الگ الگ۔ ممتاز مفتی کے مضمون ''گوریلی'' کی پہلی سطر میں یہ راز کھل جاتا ہے کہ مضمون نیلم کے بارے میں ہے جو احمد بشیر کی بیٹی ہے۔ احمد بشیر جو اپنی ذات میں ایک عہد تھا۔ محمد ظہیر بدر نے چند سال پہلے اکادمی ادبیات کی سیریز ''پاکستانی ادب

کے معمار" کے تحت احمد بشیر پر مقالہ لکھا۔ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو لاہور میں اس کی تقریب پذیرائی اکادمی ادبیات لاہور نے کرائی۔ احمد بشیر کے قلم کی کاٹ اپنی مثال آپ ہے۔ سنی سنائی بات ہے کہ "کسی" نے احمد بشیر سے اپنے بارے میں مضمون کی فرمائش کی تو اُس نے کہا کہ لکھ دیتا ہوں مگر پھر گلہ نہ کرنا۔

مضمون لاجواب ہے۔ لاجواب کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ یہ امر متنازع ہے۔ ہر ایک کے سوچنے اور لکھنے کا انداز الگ ہے۔ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ادب کا معمار کہلانے کا معیار کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو آؤٹ سائیڈر ہوں، میں اس بارے فتویٰ کیسے جاری کر سکتا ہوں۔ میں نے یہ سوال اکادمی ادبیات اسلام آباد کے مہتمم کو لکھا بھیجا۔ سوال تھا "ادب کا معمار کہلانے کا معیار کیا ہے۔ مجھے اپنے ذرائع سے پتا چلا کہ میرا سوال خشکی کے راستے نائب مہتمم کے پاس لنگر انداز ہے۔ جواب سے تا حال محروم ہوں۔ "ادب کا معمار کہلانے کا معیار کیا ہے" "ادیب" اور "غیر ادیب" میں کیا فرق ہے، یہ طے ہوتا رہے گا۔ آپ فی الحال مضمون "گوریلی" میں لکھے ممتاز مفتی کے کچھ جملوں کا لطف لیجیے۔

☆....." صاحبو مہذب ہونے کے باوجود اور ترقی کے باوجود جس کے ہم داعی ہیں اپنی چٹی قمیض اور سفید کالر کے باوجود آج بھی ہم گرتے گدھے سے ہیں اور غصہ کمہار پر نکال کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ ماں اپنے میاں کا غصہ بچوں پر نکالتی ہے۔ بابو، صاحب کا غصہ بیوی پر نکالتا ہے اور ساس اپنی جوانی کا غصہ بہو پر نکالتی ہے۔ نیلم کے انتقام کے کوائف اگرچہ دیکھنے میں انوکھے لگتے ہیں لیکن وہ انوکھے نہیں۔ سیدھے اور صاف ہیں، معصوم ہیں"..... صفحہ 216

☆....." وہ (نیلم احمد بشیر) باری باری اُنھیں بند گرد آلود الماریوں سے نکالتی ہے، جھاڑتی ہے، پونچھتی ہے، چمکاتی ہے "..... صفحہ 216

☆....." زندگی بھر اُسے (نیلم احمد بشیر) یہ خوف دامن گیر رہا کہ کیونکہ اسے علم تھا کہ بڑے اور گھنے درخت تلے اگنے والے بوٹے لازماً کبڑے رہ جاتے ہیں اس کے دل میں احتجاج کی کھچڑی پکتی رہی۔ نہیں میں قد آور بنوں گی۔ اس کی پھوپھی پروین عاطف جو خود گنوں کی تھیلی ہے جس نے کانٹوں سے اُلجھ کر زندگی بسر کرنا سیکھ رکھا ہے اُن گوریلوں کی لیڈر ہے جسے نیلم کی صلاحیتوں کا شعور ہے"..... صفحہ 218

تیکھے اور شوخ جملے سرور آور ہیں۔ انھیں پڑھنے سے سوچ دریچے کھلتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو یہ لطف دیتے ہیں۔ ایسے جملوں کی تخلیق کے دوران لکھنے والے کو کس کرب سے گزرنا پڑتا ہے، یہ تو لکھنے والا ہی جان سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ایرِش فرِیڈ اوران کی نظمیں

میں کئی روز سے دیکھ رہا تھا کہ باہم بات چیت کے دوران میں میرے دوست رائے امجد علی کی جرمن بیگم روزی اچانک اپنی مادری زبان بولنے لگتی تھیں۔ خاص کر جب انھیں امجد سے بات کرنا ہوتی۔ ان کے خاموش ہونے پر امجد مجھے اردو یا پنجابی میں بتاتا کہ بیگم کیا کہہ رہی تھیں۔ امجد علی ''مزنگی'' ہونے کی وجہ سے میرا محلے دار بھی تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے کے باعث میرا ہم۔ مکتب بھی۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی جرمنی جا بسا تھا۔ اب کے لاہور آیا تھا تو اس کے ساتھ اس کی جرمن بیگم بھی تھیں۔ یہ ۸۰ کے عشرے کے اواخر کی بات ہے۔

خیر، روزی بھابی، ظاہر ہے، پہلی بار لاہور یعنی پاکستان کی سیر کر رہی تھیں اور ہم سبھی خود کو ان کا میزبان تصور کرنے پر اترا رہے تھے۔ قیام لاہور کے دوران میں جہاں انھیں یہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کروائی گئی وہاں تعلیمی ادارے بھی دکھائے گئے۔ میری اور امجد کی مشترکہ مادرِ علمی گورنمنٹ کالج کا چکر تو لازم تھا مگر میں نے انھیں پنجاب یونی ورسٹی میں اپنے سوشیالوجی کے شعبہ میں بھی مدعو کیا جہاں صدر شعبہ ڈاکٹر محمد انور صاحب سمیت دیگر اساتذہ اور میرے چند ہم جماعتوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔

روزی پناہ گزینوں کی بہبود سے متعلق اقوام متحدہ کے ایک ادارے سے منسلک تھیں اور عمدہ انگریزی بولتی تھیں مگر جب وہ امجد کے ساتھ جرمن زبان میں گفتگو کرنے لگتیں میں ان دونوں کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ چناں چہ جی

حامد یزدانی

میں ٹھانی کہ اگلی بار جب امجد اور بھابی صاحبہ سے ملاقات ہوگی تو امجد کو کم از کم مترجم کی ذمہ داری تو ادا نہ کرنا پڑے گی۔ یعنی یہ کہ میں نے جرمن زبان سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ امجد اور روزی بھابی کے جرمنی لوٹ جانے کے بعد میں نے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور میں داخلہ لے لیا۔ دن میں نیو کیمپس میں میں ایم اے سوشیالوجی کی کلاسز اور شام کو گلبرگ میں جرمن زبان کے کورسز۔

اگلے برس جب امجد لاہور آیا تو وہ اکیلا تھا۔ میں نے اسی کو جرمن زبان میں چند جملے سنائے اور یوں اسے خوش گوار حیرت میں ڈال کر خوش ہو لیا۔ گویا میں اپنے مقصد میں جزوی طور پر کام یاب ہو گیا تھا۔ تاہم اس وقت میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ دوستانہ محبت میں ابتدا ہونے والی میری یہ غیر رسمی سی کوشش مستقبل میں میرے لیے جرمنی کے سفر، تعلیم اور ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے سے پیشہ ورانہ وابستگی کا وسیلہ بننے والی ہے۔

کالج میں سوشیالوجی پڑھاتے ہوئے مجھے تین برس تو ہو ہی گئے تھے کہ 1989 میں گرمیوں کی تعطیلات میں جرمن زبان کے ایک مختصر کورس میں داخلہ لیا اور اپنے دوست کے پاس جرمنی کے شہر کولون جا پہنچا۔ امجد تب تک ریڈیو دو بچے دو ویلے، دی وائس آف جرمنی سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اردو، ہندی اور بنگالی زبانوں کی نشریات کے سربراہ ڈاکٹر گوئبل گروس سے میں ایک بار گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور میں مل چکا تھا۔ باقی کارکنان سے بھی جلد ہی جان پہچان ہو گئی اور میں جز وقتی طور پر اردو سروس کے لیے کام کرنے لگا۔ چھٹیوں کے اختتام پر پاکستان لوٹتے ہوئے ڈاکٹر گوئبل گروس نے مجھے تین سالہ کل وقتی ملازمت کی پیش کش کی جسے میں نے قبول کیا اور پاکستان آ کر واپسی کی تیاری کرنے لگا۔ اگلے سال میں جرمنی کی کولون یونیورسٹی کا بھی طالب علم تھا اور وائس آف جرمنی کی اردو نشریات کا ایڈیٹر یا پروڈیوسر بھی۔

ابتدائی مصروفیت اور سیر و تفریح کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑا تو لاہور کے دوست، پاک ٹی ہاؤس اور اہل خانہ یاد آنے لگے۔ ادبی کمی کو پورا کرنے کے لیے حلقہ ارباب ذوق، جرمنی کی بنیاد رکھ دی اور پاکستان سے رابطے کے لیے ایک اخبار میں جرمنی کی ہفتہ وار ادبی ثقافتی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔

امجد علی تو برسوں سے یہاں رہ رہا تھا اور جرمن زبان و ثقافت سے خوب آگاہ تھا مگر میری جرمن درسی حدود سے آگے نہ بڑھی تھی۔ ادب تو اس کا اگلا پڑاؤ تھا۔ سو، ادارے کی لائبریری، مقامی کتب خانہ اور بک سٹورز سے راہ و رسم بڑھائی اور جرمن ادب کا مطالعہ آغاز کر دیا۔

متون کو سمجھنے کے لیے اردو اور انگریزی کے

الفاظ و مترادفات تلاش کیے جاتے اور لکھے جاتے۔ یوں الفاظ سے جملے اور مصرعے اور پھر چھوٹی چھوٹی جرمن نظمیں اردو میں منتقل ہونے لگیں۔ تراجم کا جو شوق گورنمنٹ کالج کی سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ہفتہ وار اجلاسوں میں شرکت سے آغاز ہوا تھا اب دور دیس میں دل لگانے کی ایک باقاعدہ حکمت عملی کے طور پر کام آ رہا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ مطالعہ کرتے ہوئے جو نظم دل کو بھاتی عادتاً اس کا ترجمہ اردو میں کرتا جاتا۔ اس طرح بہت سی نظمیں 'طالب علمانہ جوش' ہی میں اردو کے قالب میں ڈھل گئیں جن میں ریلکے، ایرش فریڈ، رشارد آندرز، ہانس ورزکوہن، والٹر ہیلموٹ فرٹس، فریڈرش ہیبل، ہائینس پیونتک، یرگن تھیوبالڈی، ہانس سیبولکا اور مشرقی جرمنی کے نمائندہ شاعر یوہانس بوبروفسکی جیسے اہم شعرا کی متعدد نظمیں شامل ہیں۔

انھی دنوں سابقہ مشرقی جرمنی کے ریڈیو برلن سے ایک براڈ کاسٹر اور ادبی شخصیت اجول بھٹا چاریہ کولون آئے۔ انھیں بھی ادبی تراجم کا شوق تھا۔ ہم کھانے اور چائے کے وقفے میں کینٹے ٹیریا میں محفل جماتے جس میں وہ جرمن نظموں کے ہندی تراجم مجھے سناتے۔ مجھے ان کے کیے ایرش فریڈ کی نظموں کے تراجم بہت اچھے لگے۔ چناں چہ میں نے بھی اس شاعر کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ جرمن زبان کے یہ اہم شاعر دراصل دوسری عالمی جنگ کے دوران ادبی منظر نامہ پر نمایاں ہوئے۔

ایرش فریڈ کی پیدائش مئی 1921 میں ویانا، آسٹریا میں ہوئی تھی۔ لڑکپن ہی سے سیاسی نظمیں اور مضامین لکھنے لگے تھے۔ آسٹریا پر نازی جرمنی کے تسلط کے بعد ایرش فریڈ نے وہاں سے فرار ہو کر لندن میں پناہ لی جہاں وہ بی بی سی کی جرمن نشریات سے منسلک ہو گئے۔ اس دوران میں وہ شاعری بھی کرتے رہے اور مضامین اور ڈرامے بھی لکھتے رہے۔ ان کا ایک ناول بھی منظر عام پر آیا۔ ان کا اولین شعری مجموعہ 1944 میں شائع ہوا۔ 1978 میں ان کی اعزاز یافتہ کتاب ''سو نظمیں جن کا وطن نہیں'' بیک وقت سات زبانوں میں شائع ہوئی۔ 1979 میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''محبت کی نظمیں'' منظر عام پر آیا جبکہ 1986 میں ان کے نثر پاروں کی کتاب اور یادداشتیں اشاعت پذیر ہوئیں جن کو عالمی ادبی حلقوں میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ایرش فریڈ اشتراکی طرزِ فکر سے متاثر تھے۔ انھیں امن و آزادی اور انسانی بہبود کا علم بردار مزاحمتی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ وہ نسل پرستی، تسلط اور جبریت کے عمر بھر مخالف رہے۔ جب امریکا نے ویت نام میں دراندازی کی تو ایرش فریڈ نے اس اقدام

کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ وہ اگرچہ ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے مگر اسرائیل کی نسل پرست اور فاشسٹ کارروائیوں کے سبب وہ صیہونیت کے مخالف اور فلسطینیوں کے حامی رہے۔ اس موضوع پر ان کی بہت سی نظمیں ہیں۔ افسوس کہ مغرب کے ادبی ناقدین بوجوہ ان نظموں کا حوالہ نہیں دیتے اور انھیں 'سیاسی' اور 'متنازعہ' وغیرہ قرار دے کر نظر انداز کرتے آرہے ہیں۔

ایرش فریڈ نے ایک اور کمال کا کام کیا۔ انھوں نے ڈلن ٹامس، ٹی ایس ایلیٹ، گراہم گرین اور سلویا پلاتھ جیسے انگریزی زبان کے نامور تخلیق کاروں کے تراجم جرمن زبان میں کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ ایرش فریڈ کو زندگی میں متعدد اہم ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔ اب آسٹریا کا قومی ادبی ایوارڈ انہی کے نام سے منسوب ہے۔

ایرش فریڈ کا انتقال 22 نومبر 1988 کو جرمنی میں ہوا لیکن ان کی تدفین لندن میں ہوئی۔ اپنے پیچھے باکمال نظموں کا قابلِ قدر اثاثہ چھوڑ گئے جس سے اب بھی دنیا بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں کے اردو تراجم ڈاکٹر منیر الدین احمد کے علاوہ کچھ دوسرے لکھاریوں نے بھی کیے ہیں جو مترجمین کے حسنِ انتخاب اور معیارِ ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ اس اعتبار سے میں نے ایرش فریڈ کی جن نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے وہ میرے ذوقِ انتخاب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ میں نے ان نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے جہاں اردو شعری آہنگ کو ملحوظ رکھنے کی سعی کی ہے وہاں اصل نظموں کے مزاج اور اسلوب کو بھی مدِ نظر رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اس میں کامیاب کتنا رہا ہوں یہ تو پڑھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ سو، چند مختصر نظموں کے تراجم یہاں پیش کر رہا ہوں:

یہ کیا ہے

بے تکی بات ہے
عقل تو یہ کہے
جو یہ ہے، سو یہ ہے
یہ محبت کہے
قہر ہے
قیاس کہتا ہے یہ
درد ہے، درد ہے اور کچھ بھی نہیں
خوف کہتا ہے یہ
کوئی مایوس کن بات ہے
کہتی ہے آگہی
جو یہ ہے، سو یہ ہے
یہ محبت کہے
یہ تو کچھ مضحکہ خیز ہے
فخر کہتا ہے
نِری حماقت ہے
بولے کوئی احتیاط
غیر ممکن ہے یہ
کہتا ہے تجربہ
جو یہ ہے، سو یہ ہے

یہ محبت کہے

.....

ڈر اور شک

اس پر شک نہ کرو
جو کہے
کہ وہ ڈرتا ہے
ڈر واس سے مگر
جو کہتا ہے
کہ وہ شک ہی نہیں کرتا

.....

راکھ

سو، میں راکھ ہوں
اپنے شعلوں کی
جن کی کہ لکڑی بھی
میں تھا
مجھے ٹکڑے ٹکڑے کیا جس نے
میں ہی کلہاڑی تھا گویا
تھمی تھی جو
میرے ہی ہاتھوں میں
مجھ کو جلایا جنھوں نے
اس سے پہلے کہ میں ڈھونڈ پاتا
وہ ٹھنڈک کہیں
اپنی ہی راکھ میں۔

.....

ایک کوشش

مری تو یہ کوشش تھی
میں کام کرتے ہوئے
اپنے ہی کام پر دھیان دوں
بجائے تمہارے۔
مگر (کیا کروں) میں
مسلسل ابھارا گیا تھا مجھے
ایسی ناکامی پر۔

.....

بازدید

یہ تھکن کے پیڑ
برسوں بعد
پھر سے جھانکتے ہیں
رات کے اس آسماں کے سامنے
امید کی دیواروں کے پیچھے سے
جن کو منہدم کرنے لگے ہیں
اک بہت اونچی عمارت کے لیے
پران کی شاخیں
اب بھی اوپر کو لپکتی ہیں
کسی جنت کی جانب
جو رہی محروم اپنے دیوتا سے
اور ان پیڑوں کی پتوں کی
نوکیلی سرسراہٹ
کھڑکیوں سے اس طرح آتی ہے
جیسے موت کو نیند آ رہی ہو
چاند، لیکن اب، نکلتا ہی نہیں۔

.....

تعمیری خود انتقادی

میری کمزوری تھا
میرا بالادستی کا احساس

میں نے اس کو زیر کیا
اب کامل
بے عیب ہوں میں۔

.....

تفنن برطرف

بچے
پتھر مارتے ہیں
ان مینڈکوں کو
بس ہنسی ہنسی ہیں
مینڈک (بے چارے)
مرتے جاتے ہیں لیکن
پوری سنجیدگی سے۔

.....

پھر سے وہ

وہ مجھ پر
اور میرے ساتھیوں پر وار کرتے ہیں
اسی سفاکیت سے
جو انہوں نے غالباً ہم سے ہی سیکھی تھی
سور
وہ دم کٹے بندر
ہماری نقل کیسی خوب کرتے ہیں!
ہمارے جیسا ہی انداز ہے ان کا
ہمارے جیسے سارے ڈھنگ
لیکن فرق ہے تو بس یہی
ہم ہیں درست
اور وہ غلط
بالکل غلط

.....

ایک مصروف شاعر سے کچھ سوالات

کتنا وقت لگے گا
آخر کتنا وقت لگے گا تم کو
میری بات کو ہتک جاننا کب تم ترک کرو گے؟
کیا میں ابھی سے
پھر سے کچھ ایسا کہنے والا ہوں؟
میرے کہے کی کیا کوئی وقعت بھی ہے؟
کیا اب تک ناقابل فہم نہیں وہ ٹھہرا؟
یا بالکل مبہم؟
کیا میں پھر سے یونہی ٹرٹر کرتا جاؤں گا؟
"کیا میں ہمیشہ سے یونہی کہتا آیا ہوں؟"

.....

ان کا نوحہ جو پکارتے رہے

"تم نے کیا کیا؟"
"بس پکارنے دیا انہیں۔"
"تو دوسروں نے کیا کیا؟"
انہوں اپنے مونہہ
ٹھونس ٹھونس بھر لیے۔
"وہ سب پکارتے تھے کیا؟"
"مدد، مدد۔ پکارتے تھے۔"
"کس لیے؟ کس کے لیے مدد، مدد پکارتے تھے؟"
"غالباً مرے لیے۔"
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

ہاجرہ مسرور

آغاز مضمون بین الاقوامی شہرت یافتہ عظیم و معروف مزاح نگار، افسانہ نگار، شاعر، مترجم، نقاد، معلم، برطانوی ہندوستان کے ماہر نشریات سیّد احمد شاہ المعروف پطرس بخاری صاحب کے چند انمول جملوں سے کیا جاتا ہے جو انھوں نے بطور نذرانہ عقیدت ہاجرہ مسرور کے افسانوی مجموعہ 'چوری چھپے' کے اوراق پر دیباچہ کی صورت ثبت کر دیئے ہیں، ملاحظہ ہو! "شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں۔ اس لئے یہ غلط فہمی ہے کہ خواتین کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرت نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔ یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک اکثر ادیب خواتین میں ملے گی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں بلکہ خلوص اور دیانت داری سے لکھتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس معاملے میں انکا 'نامۂ اعمال' مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ بے شک ادیب خواتین تعداد میں زیادہ نہیں، لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئیداد جس کی جرأت اور بے ساختگی کے ساتھ انھوں نے پیش کی ہے۔ اس سے ہمارے مردانہ ادب کی ریاکاری کے گھونگھٹ الٹنے پڑے ہیں اور سب اُردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔ ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ ان کے پہلے مجموعوں میں بھی انھوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے اور یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری

ظفر معین بلے

ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہے۔" ہاجرہ مسرور نے خواتین کے استحصال اور جنسیت کے موضوع کے خلاف لکھا ہے۔ ہاجرہ مسرور نے اپنی تحریروں کے ذریعے اُردو ادب کی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے اور آج بھی قارئین کے دلوں میں اپنا ایک اعلیٰ ادبی مقام بنائے ہوئے ہیں۔ ہاجرہ مسرور 17 جنوری 1930 کو لکھنؤ میں ڈاکٹر ظہور علی خان کے ہاں پیدا ہوئیں۔ آپ کے نام 'ہاجرہ' کا ذکر بھی بے تکلف اور یادداشت کے طور پر ذہن پر نقش ہے۔ محترم دادا جان نے کہا "اس نوزائد بچی کا نام 'احمد بی بی' رکھو۔ والدہ کو اعتراض تھا وہ جل گئیں اور کہا 'بڑے میاں کو تو ایسے ہی خواب نظر آتے ہیں۔ نوزائد بچی کا نام تو 'ہاجرہ' ہوگا، اور والد محترم نے کہا 'مسرور' ہونا چاہئے۔ ننھی سی جان ان تینوں ناموں میں گھسٹتی پھریں اور آخر کار 'ہاجرہ مسرور' طے کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے علاوہ یوپی کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں گھر پر ہی ہوئی۔ اس سلسلے میں آپ کی یادیں بے حد تکلیف دہ تھیں کہ اس گھریلو ابتدائی طریقہ تعلیم میں شام کے وقت ایک عدد ماسٹر اور ہر صبح ایک مولوی صاحب کا سامنا ضروری تھا۔ یہی سلسلہ اس وقت جاری رہا جب آپ کا داخلہ ایک مشنری سکول کی کسی جماعت میں ہوا۔ گھر کا ماحول کافی دلچسپ تھا۔ تنخواہ سے پہلے والدین اگلے مہینے کا بجٹ میں جٹ جاتے اور خصوصی طور سے ایک اچھی خاصی رقم ادبی کتابوں، رسالوں میں صرف کرنا لازمی ہوتا۔ بچیوں کے کھلونوں اور دیگر تفریح کی اہمیت صفر تھی۔ بچیوں اور زنانہ کے عمدہ جریدے "نگار"۔ "کلیم"۔ "ہمایوں"۔ "ادبی دنیا" اور کچھ دینی رسالے اور کتابیں باقاعدگی سے گھر ارسال ہو جاتیں۔ والد محترم کا جہاں کہیں تبادلہ ہو جاتا ان کے حلقہ آباد میں مردانہ حصہ میں ادبی محفلیں ہوتیں، جہاں ادبی، سیاسی اور شاعری کا ماحول سے سجتا، سنورتا۔ اسی دوران والدہ محترمہ کا ادبی سفر اور والد محترم کی صحافتی مصروفیات بھی عروج پر تھیں۔ بچپن میں ہاجرہ مسرور کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا، آپ کی بہن خدیجہ مستور بھی پہل کرتیں۔ ہاجرہ مسرور کے والد محترم ڈاکٹر سید ظہور علی خان برطانوی فوج کے میڈیکل افسر تھے۔ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔ ہاجرہ مسرور کی بہن خدیجہ مستور ایک معروف ناول نگار تھیں، ایک چھوٹے بھائی خالد احمد خان، جو شاعر، ڈرامہ نگار اور اخباری کالم نگار بھی تھے۔ آزادی کے بعد خالد احمد خان، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور پاکستان ہجرت کر گئے اور لاہور میں آباد ہوئے۔ والد محترم ڈاکٹر ظہور علی خان کی موت کے بعد ہاجرہ کے سوچنے کا انداز ہی

بدل گیا۔ ہاجرہ کے ذہن میں طوفاں سا برپا رہا، برداشت کی قوت بالکل نہیں تھی اور اسی صدمہ میں ان کے قلم سے ادبی تحریروں کی دھارا پھوٹ پڑتی اور اس کے بعد آپ کے ذہن کے تمام ادبی و تخیل کے دروازے کھل گئے اور انھیں حالات نے آپ کو ایک معروف افسانہ نگار بنایا۔ ہاجرہ مسرور نے 13 سال کی عمر میں پہلا افسانہ لکھا تھا جو بچوں کے ایک رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں ''بھوک'' کا شدید احساس ہوتا' جو اس وقت آپ کا خاندان ایک بدترین نازک دور سے گذر رہا تھا۔ دو سال بعد جب آپ کا افسانہ ''ہائے اللہ'' ننھے میاں' اور 'ساقی' میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے موضوع کی وجہ کچھ شدت پسند بزرگوں نے ہنگامہ مچایا، ہر طرف سے تنقیدوں کی برف باری، ژالہ باری سے مسرور بے حد پریشان رہیں۔ آپ کی خالہ جان جو علی گڑھ میں زیر تعلیم تھیں اور ایک ہاسٹل میں مقیم تھیں۔ 'ہائے اللہ' کے موضوع سے ان کے ساتھیوں، احباب اور استادوں کی تنقید کی وجہ سے اتنی زیادہ دل برداشتہ ہوئیں کہ انھوں نے ہاجرہ کو سخت الفاظ میں خط لکھا اور سخت تاکید کی اور آگاہ کیا کہ اس طرح کے موضوعات سے سخت پرہیز کریں۔ آپ کے ماموں نے بھی سخت الفاظ میں کہا کہ 'لکھو ضرور، لیکن حق و سچ اور حقیقت کو اچھے الفاظ میں لکھنا ضروری ہے'۔

ہاجرہ مسرور کافی پست ہمت ہوئیں۔ لیکن آپ کی والدہ محترمہ کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے آپ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہاجرہ اب اس قدر سہم گئیں کہ ہر تحریر کو کافی سنجیدگی سے، ناپ تول کر لکھنا شروع کیا اور ترقی کی بلندی کی طرف گامزن رہیں۔ اب تو آپ اپنی ہر ادبی تحریر ہی نہیں کچھ سطروں کے خطوط بھی لکھتیں تو ان پر والدہ محترمہ کی نظر ثانی بے حد ضروری تھی اور اس کے بعد ہی وہ منظر عام پر لے آتیں۔

اُردو افسانہ نگاروں میں بلاشبہ ہاجرہ مسرور کا اپنا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ اپنی بڑی بہن ''خدیجہ مستور'' کے ہم اثر اپنے ادبی زندگی کا آغاز بچپن ہی میں شروع کیا۔ ہاجرہ نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقہ، نچلے طبقہ کی زندگی اور دیہی علاقوں میں جاگیر دارانہ عیاشی اور خصوصی طور سے خواتین پر تشدد کی عکاسی کی، دل کو چھو لینے والی تخلیق قارئین کے نظر کرتیں 'آپ کی اُردو ادب کے معروف انقلابی شاعر اور فلمی نغمہ نگار 'ساحر لدھیانوی سے منگنی ہوئی تھی، لیکن ایک حادثہ یوں ہوا ایک ادبی محفل میں ساحر لدھیانوی نے کسی غلط تنقیدی لفظ کا استعمال کیا تو ہاجرہ اس تنقید پر بے حد ناراض ہوگئیں اور منگنی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ہاجرہ مسرور نے اپنی چھوٹی سی عمر ہی سے افسانے لکھنا شروع کیا۔ 'ساقی' اس مشہور ادبی رسالہ میں شایع ہونے والے آپ کے افسانوں کو

خوب پذیرائی ملی۔ جرأت مندانہ تخیل اور غیر روایتی انداز میں سادہ لیکن مؤثر نثر اور اپنے ایک الگ انداز میں افسانے لکھتی تھیں اور ہاجرہ نے اُردو افسانوں کی تاریخ میں اپنا نام رقم کرلیا۔ آپ نے احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ادبی رسالہ ''نقوش'' کی ادارت کی۔ نقوش ایک ادبی جریدہ جس کا اجرا مارچ 1948 میں ہوا۔ اس جریدہ کے اولین مدیر اُردو کے نامور شاعر، نقاد اور صحافی ہاجرہ مسرور کے خاوند اور احمد ندیم قاسمی کے اور آپ خود تھیں۔ نقوش کے پہلے شمارے میں جن ادیبوں کے تخلیقات شامل ہوئے ان میں ''کرشن چندر' احمد ندیم قاسمی' ہاجرہ مسرور' عزیز احمد' حفیظ جالندھری' سیماب اکبرآبادی' یوسف ظفر' قتیل شفائی' اثر لکھنوی' اختر شیرانی' فراق گورکھپوری' حفیظ ہوشیار پوری' علی سردار جعفری' عبدالحمید عدم' خالد قادری' مختار صدیقی' سیف الدین سیف' اور عبدالعزیز فلک پیا' جیسی معروف ہستیاں، ادبا و شعرا حضرات تھے۔ خواتین کے سماجی، سیاسی، قانونی اور معاشی حقوق تحریک آپ کا عین مقصد تھا۔ ہاجرہ مسرور ''ترقی پسند مصنفین'' کی تحریک کی مشعل بردار ہونے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں حقوقِ نسواں کے علمبرداروں میں سے ایک تھیں۔ ہاجرہ مسرور کے یکبابی ڈراموں کے مجموعہ کے علاوہ چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ''1- چاند کے دوسری طرف' 2 - 'تیسری منزل' 3 - 'اندھیرے اجالے' 4- 'چوری چھپے' 5- 'ہائے اللہ' 6- 'چرکے' اپنے ڈراموں میں اپنے ماضی کا انتقام لیا ہے۔ سکول کے زمانے میں ایک ڈرامہ میں حصہ لینے کا موقعہ ملا تو مارے ہیبت اور گھبراہٹ سے بے ہوش ہوگئیں اور زمیں پر گر پڑیں۔ اب ڈرامہ نگاری میں مصروف رہیں اور تمام یک بابی ڈرامے لکھے ہیں'' کھلی کھڑکیاں''۔ '' دستک''۔ ''فاطمہ''۔ ''گوری خالہ'' وغیرہ یکبابی ڈراموں کو کالج اور دیگر کئی اداروں نے انہیں کھیلا۔ ''چوری چھپے'' اس شمارے میں ہاجرہ مسرور کے قابل ذکر اٹھارہ افسانوں کو جمع کیا گیا۔ اس تصنیف کے اوّل صفحہ پر ہاجرہ نے اپنے 'پیش لفظ' میں لکھا ہے کہ ''محترم مولانا مصطفیٰ خان مداح حرم اور (مرحوم) محترمہ اکبری بیگم صاحبہ کے نام جنھوں نے ہماری یتیمی کی تپتی ہوئی دھوپ پر اپنے مہربان وجود کا ٹھنڈا سایہ ڈالا اور جن کے کردار کی عظمت کے نقوش میرے ذہن میں کبھی نہ دھندلا سکیں گے''۔ ہاجرہ مسرور کے افسانے لازوال معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم کے بعد کے واقعات سے متعلق ہیں اور کئی افسانوں میں ذہنی خلفشار، فکرمندی اور مختلف طبی مسائل شامل ہیں۔ اگرچہ تقسیم ''موت اور دودھ'' جیسی کہانیوں میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے، جو ایک دور دراز گاؤں میں تشدد اور خروج کی

تصویر کشی کرتی ہے۔ The deceased Nation" جس میں پناہ گزینوں کے کیمپ کے تلخ واقعات تحریر کئے گئے ہیں اور زیادہ تر افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی ہے۔ خواتین کی اندرونی زندگی کی آہیں، ان کی اذیتیں اور تکالیف اور مجروح زخموں کا درد اور صدمات کے طور پر تیز تیکھے خنجر نما قلم سے اور ان کے لہو سے لکھی گئی داستانیں اس ماحول میں اپنا سر پیٹ پیٹ کر تلملاتی ہوئی چیخ رہی ہیں لیکن پرسان حال کوئی نہیں۔۔۔!! مشہور زمانہ افسانہ "بندر کا گھاؤ" جو ایک ایسا مسئلہ جو کبھی حل نہیں ہوتا۔ ہاجرہ مسرور نے کس موثر انداز میں اس ظلم کو بیان کیا ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

"چاند کی دوسری طرف" اس افسانے میں لڑکے اور لڑکیوں کے رشتوں کے دوران ہونے والے مکروفریب پر مبنی ہے۔ وہ نیا نیا صحافی بنا تھا اور اپنے ایک تھانیدار دوست جبار کے پاس ہر روز ایک نئی خبر لینے جایا کرتا۔ اس دن بھی جبار کے پاس تھا کہ اچانک ایک شخص منع کرنے کے باوجود تھانے میں جبار کے پاس چلا آیا۔ اس شخص نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے تھانیدار سے کہا' اس نے اپنی بے حد خوبصورت بیٹی کے لئے ایک اہل رشتہ طے کیا تھا۔ جب نکاح ہوا تو پتہ چلا کہ دولہا وہ لڑکا نہیں تھا جسے اس نے پسند کیا تھا، بلکہ وہ تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ اس سے مایوس ہوکر پہلے تو اس نے داماد کو ختم کرنے کے بارے میں سوچا، مگر اپنے مقصد میں ناکام رہنے کے بعد اس نے اپنی بیٹی ہی کو قتل کر دیا۔ افسانہ "تیسری منزل" دراصل کراچی اپارٹمنٹ کی عمارت تیسری منزل مس ڈور، ایک عیسائی خاتون رہتی ہے جسے رقص کا بے حد شوق ہے۔ مس ڈور ایک بال روم ڈانسر ہے وہ ایک مسلم شومیکر حنیف کو اپنی فینسی ڈانس سکھاتی ہے اور اپنی بے لوث محبت کو اپنانے کے لئے اپنے تمام جذبوں کو فنا کر دیتی ہے، حنیف کے کاروبار کو ترقی دیتی ہے اور حنیف کے بیوی بچوں کو بھی خوش دلی سے قبول کر لیتی ہے۔ لیکن حنیف ایک بے وفا مرد ثابت ہوتا ہے۔؟؟؟؟

"لیٹیز" میں نوجوان خواتین کا ایک گروہ کھلے عام بغاوت پر ہے۔ انھیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کہ ان کے دوپٹے کیسے سر سے گر جاتے ہیں اور خاندان کے مردوں سے چرائی سگریٹ نوشی میں مگن ہو جاتی ہیں اور محبت اور عشق میں نظمیں، نغمے لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ باری آپا جو ہر وقت سنجیدہ اور متین رہتی ہیں۔ ان کا ایک خفیہ محبت کا رشتہ ہے۔ "دی سلیپ" میں خوبصورت نجمہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک درندہ صفت آدمی سے صرف اس لئے کر دی گئی کہ وہ دولت مند ہے۔ یہ بغاوتیں عموماً خوشی یا پدارانہ نظام سے فیصلہ کن وقفے پر ختم نہیں

ہوتیں' 'ہائے اللہ'' بچپن ہی سے لڑکیوں پر بے جا بندشوں کے نتائج میں بتایا گیا ہے کہ دادی اپنی پوتی منھی کو اپنے چچازاد بھائی صلو بھیا کے ساتھ بھی کھیلنے سے منع کرتی اور وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی تنبیہیں اور دھمکیاں دیتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس منھی کی رغبت اپنے چچازاد بھائی صلو کی طرف بڑھتی رہتی ہے اب وہ شباب کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو ایک نامعلوم جذبہ کے تحت اپنے چچا زاد بھائی کے کمرے میں پہنچ جاتی ہے۔ صلو بھیا سو رہے تھے، اس کے بکھرے ہوئے بال اور بھیگی ہوئی مسیں دیکھ کر اور دادی ماں کی زیادتیاں یاد کر کے اس کا دل مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنا سر صلو بھیا کے سینے پر رکھ دیتی ہے۔ اسی وقت دادی منھی کو تلاش کرتے ہوئے اس کمرے میں پہنچ جاتی ہے ان کے پوپلے منہ سے ''ہائے اللہ'' کے سوا کچھ نہیں نکل پاتا۔ ''عورت'' میں عورت کی عزت و نفس اور انتقام کو بنیاد بنا کر لکھی گئی اس کہانی میں تصدق اور قدسیہ آپس میں محبت کرتے ہیں لیکن شادی نہیں ہو پاتی اور لیکن قدسیہ کا بیاہ کاظم سے ہو جاتا ہے۔ تصدق پر اس کا نفسیاتی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک دن قدسیہ سے ملنے آتا ہے تو کاظم قدسیہ سے حسد کی آگ میں جلتا ہوا زہریلی ناگن سا مخاطب ہوتا ہے اور قدسیہ خود پہ پستول کی گولی سے خودکشی کر لیتی ہے اور کاظم کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کو بیان کرتی ہوئی ''کمینی'' اس افسانے میں 'چھٹکی' ایک فقیر کی بیٹی کو فقیری یہ پیشہ کبھی پسند نہیں آیا۔ جب اس کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ کسی گھر میں جھاڑو پونچھا کا کام شروع کر دیتی ہے۔ جہاں 'معراجو میاں' سے اس کی آشنائی ہو جاتی ہے اور اس آشنائی کا نتیجہ نکاح کی میں ظاہر ہوتا ہے۔ سارا خاندان جب معراجو میاں کا بائیکاٹ کر دیتا ہے وہ دونوں میاں بیوی الگ ہو جاتے ہیں۔ ادھر خاندان والوں کا خون جوش مارتا ہے اور ایک تقریب میں دونوں کو مدعو کیا جاتا ہے، لیکن وہاں چھٹکی کے ساتھ سوتیلے برتاؤ سے چھٹکی دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور معراجو کو برداشت نہیں ہوتا چھٹکی کو گھر سے بے دخل کر دیتا ہے۔

1960 میں ہاجرہ مسرور نے فلمی اسکرپٹ اور اسکے مکالمے بھی لکھے۔ آپ کو فلم کا بہترین اسکرپٹ کے لئے ''نگار اعزاز'' سے نوازا گیا ''آخری اسٹیشن'' کے بعد آپ نے دیگر فلموں کی کہانیاں، فلمی اسکرپٹ اور مکالمہ لکھنے سے انکار کر دیا۔ 1962 میں ''مجلس ترقی ادب'' کی جانب سے یکبابی کامیاب ڈراموں کے مجموعہ ''وہ لوگ'' کے لئے ''رائٹر آف دی ائیر'' کے اعزاز سے نوازی گئیں۔ ان ڈراموں کے مجموعے کے دیباچے ''فیض احمد فیض'' اور ''امتیاز علی تاج'' نے تحریر کیے ہیں۔

محترمہ ہاجرہ مسرور 15 ستمبر 2012 کو کراچی میں انتقال کر گئیں۔

☆☆☆☆☆

جاوید قاسم ..... پوری توانائی سے شعری سفر پر گامزن

اردو شاعری میں غزل ہی وہ واحد ایسی صنف ہے جس کے عشاق میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔ دو مصرعوں اور محدود قوافی میں نئی بات کہنا یقیناً کار دشوار ہے لیکن اس کے باوجود گاہے بگاہے ایسے شاعر ادبی منظر نامے پر دکھائی دیتے ہیں جن کے ہاں نئی بات بھی ہوتی ہے اور تازگی بھی۔ یہی غزل کا کمال ہے یعنی راہ مضمون تازہ بند نہیں--- ایسا ہی شاعروں میں ہمارا شاعر جاوید قاسم ہے۔ جو شہرت اور ادبی ہنگاموں سے بے نیاز سرزمین غزل میں رنگا رنگ پھول کھلا رہا ہے۔

میاں چنوں سے لاہور ہجرت کرنے والا یہ شاعر جہاں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے زندگی سے نبرد آزما ہے وہاں لاہور جیسے بڑے دبستان میں اپنی شاعری کے حوالے سے بھی شعری حوالوں سے بھی معتبر ہے۔ یہ اور بات کہ فی زمانہ جو شعر و ادب میں نام بنانے اور شہرت کمانے کے ذرائع ہیں وہ اسے حاصل نہیں ہے۔

اس طرف اس نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی۔ وہ شعر کہہ رہا ہے اور اسی کے نشے میں سرشار رہتا ہے۔ میں جب بھی اس سے ملا ہوں تو اس سے ہمیشہ شعر ہی پر گفتگو ہوئی ہے۔ وہ کبھی کسی کا گلہ نہیں کرتا اور نہ ہی اسے یہ فرسٹریشن ہے کہ اسے وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ مستحق ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے شعر سے محبت کرنے والے سینکڑوں لوگ ہیں۔ جو اس کا اور اس کی شاعری کا احترام کرتے ہیں۔ وہ عزت اور سستی شہرت کے فرق کو جانتا ہے اسی لئے اسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔

جاوید قاسم نے اپنے شعری آغاز میں ہی اپنے شعر کے حوالے سے سنجیدہ ادبی حلقوں کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ اس نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے نیا لہجہ اپنایا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ بیدل حیدری، خادم رزمی غلام حسین ساجد، فیصل عجمی اور سلیم کوثر کے علاقے میں قیام پزیر ہوتے ہوئے وہ غزل کا اپنا لہجہ ترتیب دے رہا تھا۔

جب اس کا پہلا مجموعہ پوری عمر کا دن منظر عام پر آیا تو اس کی مجموعی فضا نے جاوید قاسم کی شاعری کے خدوخال تشکیل دیئے۔ اس کے پہلے مجموعے کے دو شعر دیکھئے:

اس سے پہلے کے چراغوں کو ہوا لے جائے
روشنی جتنی ملے جس کو اٹھا لے جائے

رات اس خوف سے آنکھوں میں گزر جاتی ہے
کوئی اس شہر کے جگنو نہ چرا لے جائے

.....

پھر اس کا دوسرا شعری مجموعہ: ''کوئی چشمہ نکل

قمر رضا شہزاد

آئے" منظر عام پر آیا۔

یہ بلاشبہ اس کی شاعری کا اگلا قدم تھا۔ اس کی فضا اگرچہ اس کے پہلے شعری مجموعے کی توسیع تھی لیکن یہاں اس تصور شعر مزید واضح ہو رہا تھا۔ وہ بنیادی طور پر جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کی محرومیاں جہاں اس کے شعر کا موضوع تھیں وہاں وہ ذات اور کائنات کے اسرار کھولنے میں مصروف تھا۔

اب اس کا تیسرا شعری مجموعہ یا عشق مدد کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

اس مجموعے میں شامل شاعری بھی فکر کے حوالے سے اس کے بنیادی موقف اور تصور کی آئینہ دار ہے۔

وہ زندگی کو جیسے دیکھتا ہے اور جیسے برتتا ہے انہی کیفیات کو اپنی پوری سچائی کے ساتھ اپنے شعروں میں ڈھال دیتا ہے۔ نامساعد حالات، معاشرتی اونچ نیچ، ذات اور کائنات کے دکھ، اور پھر محبت کی آنچ یہ سب موضوعات تخلیقیت کے ساتھ اس کی شاعری کا حصہ بنے ہیں اور یہی تخلیقیت تو ہے جو عام سی بات کو خوبصورت شعر میں ڈھال دیتی ہے۔ جاوید قاسم کو خداوند کریم نے بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے یہی وجہ ہے وہ اس کے بل بوتے پر اپنے تجربات اور مشاہدات کو شاعری کا خوب صورت پیرہن عطا کر رہا ہے۔

"یا عشق مدد" اس کی غزل کو مزید آگے بڑھا رہا ہے اور یہ بہت خوش آئند بات ہے وگرنہ میں نے بہت سے شعرا میں یہ بھی دیکھا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا انرجی لیول کم ہوتا چلا جاتا ہے اور شاعری آگے کا سفر کرنے کے بجائے یا تو پیچھے چلی جاتی ہے یا پھر وہیں ٹھہر جاتی ہے۔

جاوید قاسم کو ایک اور صلاحیت جو عطا ہوئی ہے وہ اس کا فنی طور پر مضبوط ہونا بھی ہے۔ اس کا مصرعہ رواں دواں اور مضبوط ہے۔ جو اس کے شعر کو تاثیر عطا کرتا ہے۔

"یا عشق مدد" میں سے اس کے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے:

بات لوگوں کو سمجھ میں نہیں آئی میری
عہد حاضر سے ہے بس اتنی لڑائی میری

اب تو یہ بھی نہیں رہا ممکن
اک دیا دوسرے سے جل جائے

ڈھال کو اپنی پشت پر رکھا
ہاتھ روکا نہ سامنے والا

مجھ کو معلوم تھا کہ آنسو کو
ایک دن مجھ میں پھیل جانا تھا

لہو جلا کے کوئی روشنی بنانی پڑی
پھر اس کے بعد دیئے میں قیام کرنا پڑا

میں جس طرف کا نہیں تھا ادھر شمار کیا
جہاں نے میری شرافت کو ڈد شمار کیا

یہ اک چراغ کمائی ہے زندگی بھر کی
میں اس چراغ کو کاسہ بنا نہیں سکتا

میں اب بھی ڈھونڈتا پھرتا ہوں گم شدہ تتلی
پڑے ہیں آج بھی کچھ خواب میرے بستے میں

اتر رہی ہے کسی غار کی مہک مجھ میں
بنا ہوا ہے کوئی مکڑیوں نے جالا بھی

.....

یہ تو صرف چند خوبصورت شعر ہیں جو میں نے انتخاب کیے ہیں۔ ان کے نئے شعری مجموعے یا عشق مدد میں ایسے خوبصورت بہت سے شعر مل جائیں گے۔

جاوید قاسم کا شعری سفر پوری توانائی کے ساتھ جاری ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا مجموعہ یا عشق مدد بھی ادبی حلقوں میں وہی پزیرائی حاصل کرے گا جو اس کے پہلے شعری مجموعوں کو حاصل ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

سُریندر پرکاش کے افسانہ ''اجنبی کہانی'' کا تعبیر و تجزیہ: مابعد نوآبادیاتی سیاق و تناظر میں (بقیہ حصہ)

اور اِس صورت میں جب مغربی معاشرے کو جنگ کے زمانے میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے تو مغربی سماج عائشہ جیسے کرداروں کو قُبول بھی کر لیتا ہے اور اُن کی خدمات سے مستفید بھی ہوتا ہے اور قُبولیت کی کوئی حقیقی شکل ہو تو وہاں وِسٹن جیسے کردار دھوکا دھڑی سے کام لیتے ہیں اور اپنے وطن واپس مراجعت کر لیتے ہیں مگر اکیلے ہی، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ عائشہ کو اپنے ہمراہ انگلینڈ نہیں لے جا سکتے اور اپنی واپسی کے موقع پر مقامی لوگوں کو اہلِ مشرق کے متعلق جو کہانیاں سُناتے ہیں، وہ کہانیاں انتہائی بھیانک اور خوف ناک ہیں۔ اب یہاں عائشہ جب وِسٹن کے گھر پہنچ جاتی ہے، اُس کی بنیادی سوچ تو اپنی پہلی محبت تک رسائی ہے، لیکن وہیں اُس کی سوچ ایک اور رُخ پر تبدیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ اب یہاں ایک اقتباس حیرت اور تجسس کی ملی جُلی صورتِ حال کو آئینہ کرتا ہے، جب وہ وِسٹن کے گھر ڈارکنگ میں پہنچ جاتی ہے اور عائشہ پر یہ کُھلتا ہے کہ وِسٹن شادی کر چکا ہے اور وہ عائشہ کو بُھلا کر اپنی دُنیا میں مگن ہے۔ اِس موقع پر عائشہ اور مارتھا کے درمیان مکالمے نہایت عمدہ ہیں اور مصنف کی باریک بینی کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں اور یہ بھی کہ مصنف مشرق اور مغرب کے مابین صورتِ حال سے بھی واقف ہے اور دونوں خطوں کے درمیان ذہنی و فکری فاصلے سے بھی بہ خوبی آگاہ ہے:

چناں چہ ملاقاتی سے ملنے کا کام اُس نے ملازمہ پر چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں، لیکن ایک مختصر سا وقفہ بھی نہ گزرا تھا کہ ملازمہ نے دروازے پر دستک دی۔

''اندر آ جاؤ۔'' اُس نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔'' ملازمہ نے معذرت کے لہجے میں کہا: ''ایک عورت آئی ہے۔ مسٹر وِسٹن سے ملنا چاہتی ہے۔ واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔

نبیل احمد نبیل

''ملازمہ کی آواز میں اب ہلکا سا غصہ شامل تھا۔
''عورت؟'' مارتھا نے تیز لہجہ میں سوال کیا۔
ملازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی ہاں عورت ہے، لیکن وہ یہاں کی نہیں معلوم ہوتی۔ اُس کا رنگ تو کالا ہے'' ملازمہ نے لفظ کالا پر بہ طور خاص زور دیتے ہوئے کہا۔
''اوہ'' مارتھا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اُس نے پھر ملازمہ سے پوچھا۔
''تمھارا مطلب ہے ہندوستانی یا ایسے ہی کچھ۔۔۔''
''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک بات یقینی ہے۔ وہ مسٹر وسٹن سے ہر حال میں ملنا چاہتی ہے۔ یا خدا!۔ وہ نہیں کا لفظ تو سننا ہی نہیں چاہتی۔''
مارتھا نے ایک سرد آہ بھری اور بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم اُس سے کہو۔ میں آرہی ہوں۔''
ملازمہ کے جانے کے بعد اُس نے اپنا ریڈ کراس کا لباس دُرست کیا۔ بالوں کو جمایا اور زینہ طے کرتی نیچے چلی آئی۔ مارتھا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عورت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بھی ریڈ کراس کا لباس پہن رکھا تھا۔ مارتھا نے بہ غور اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا رنگ سانولا ضرور تھا، لیکن چہرے کے نقوش سچ مچ بے حد دل کش تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ عورت اُس کے شوہر سے چاہتی کیا ہے۔
''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے شوہر سے ملنا چاہتی ہیں۔'' مارتھا نے کچھ سوچ کر گفتگو کی ابتدا کی۔
''آپ مسز وسٹن ہیں؟'' عورت نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ وہ انگریزی کافی روانی سے بولتی تھی۔ ہاں لہجہ بالکل ہندوستانیوں سے ملتا تھا۔ ''جی ہاں مجھے مسٹر وسٹن سے ملنا ہے۔''(۵)
وہاں افسانے کی پروٹیگنسٹ کو قبولیت حاصل ہے، وہ ریڈ کراس کے ذریعے وہاں جنگ سے متاثرہ لوگوں کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہی ہے اور اُسے مغربی معاشرہ قبول بھی کرتا ہے، اِس افسانے کی تیسری پرت وہی ہے جو ایک عورت کے انتقام کی صورت میں کہانی کا حصہ ہے۔ عورت کا جو ہیٹریل کا غصہ اور احساس ہے کہ مجھ سے دھوکہ دھڑی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی عورت دھوکے کو برداشت تو نہیں کرتی! وہ وسٹن کے بیٹے اور دیگر افرادِ خانہ کو اور وسٹن کی بیوی کو کوڑھ کا مریض بناتی ہے، لیکن مصنف نے صورت حال کے ذریعے تقدیر کی جبریت کو بھی مخفی نہیں رکھا، جب وہ عورت جانے کے لیے تیار تھی اور دروازے تک پہنچ چکی تھی تو وہیں فلپ زخمی ہو کر داخل ہوتا اور عائشہ اُس کا بھوسہ لیتی ہے اور اُس کے ذریعے پوری وسٹن فیملی کو کوڑھ میں مبتلا کر کے ایک عجیب و غریب طریقے سے انتقام لیتی ہے، فی الاصل وہ انتقام کے بجائے یہ سب کچھ اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے، لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے:

عورت جب دروازے تک چلی گئی- مارتھا نے پھر گفتگو شروع کر دی۔
"تو آپ بھی ریڈ کراس میں کام کرتی ہیں؟"
"ہاں" عائشہ نے جواب دیا: "میں کافی دنوں سے نرس کا کام کر رہی ہوں- جنگ کے شروع ہونے سے بھی پہلے سے"، مارتھا کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی- "اوہ میں نے تو باقاعدہ نرس کی ٹریننگ حاصل نہیں کی ہے- بس یوں ہی کام کر لیا کرتی ہوں-"
"لیکن معلوم تو ہوتا ہے کہ آپ کافی محنت کرتی ہیں-" عائشہ نے جواب دیا-
سامنے کے دروازے پر جا کر دونوں کھڑی ہو گئیں- مارتھا سوچ رہی تھی کہ اس عجیب و غریب عورت سے ہاتھ ملائے یا نہیں- عائشہ اگر اسی لمحے واپس چلی جاتی- تو شاید اس کہانی کا انجام اتنا دردناک نہ ہوتا مگر بدنصیب مارتھا کی قسمت کو یہ منظور نہیں تھا!
رُخصتی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ مارتھا کا بڑا بیٹا فلپ روتا چلاتا چلا آیا- اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور دائیں گال پر ایک چوڑا زخم تھا، جس سے خون ٹپک رہا تھا- ایک اجنبی عورت کو ماں کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا اور پھر سسکتے سسکتے سارا قصہ کہہ سنایا- وہ کھیل رہا تھا کہ اچانک پیر پھسل گیا اور گال ایک تیز پتھر پر جا پڑا- زخم کافی بڑا تھا اور اُس میں سے خون ابھی تک تیزی سے بہہ رہا تھا-
"تمہارا بیٹا ہے؟" اچانک عائشہ نے تیز لہجے میں تجّی سے پوچھا-
"ہاں" مارتھا نے دھیرے سے جواب دیا-
"بالکل اپنے باپ کے جیسا ہے-"
مارتھا کے حیرت کی انتہا نہ رہی- "تم میرے شوہر کو جانتی ہو؟"
"عقارہ میں مسٹر وسٹن کو کون نہیں جانتا-"
اور اس کے بعد جو کچھ ہوا- وہ مارتھا کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ایک بھیانک خواب بن کر رہ گیا- عائشہ نے فلپ کو ماں کی گود سے چھین لیا اور اُسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے رِستے زخم پر ایک لمبا بوسہ دیا- بہ ظاہر تو یہ ایک بوسہ تھا، لیکن مارتھا کو کچھ ایسا معلوم ہوا- جیسے کوئی سانپ اپنے دشمن کے جسم میں زہر انڈیل رہا ہو!
فلپ کی سسکیاں ایک لمحے کے لیے تھم گئیں- پھر اُس نے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا- اب اُس کی آواز میں ڈر اور خوف زیادہ شامل تھا- مارتھا نے آگے بڑھ کر بیٹے کو اپنی گود میں لے لیا اور شعلہ بار نگاہوں سے عائشہ کو دیکھتی ہوئی چلائی-
"تم نے کیا سوچ کر ایسا کیا؟ جاؤ- ابھی جاؤ- میری نظروں کے سامنے سے اسی وقت دُور ہو جاؤ-"
لیکن عائشہ اب بھی مسکرا رہی تھی- اب تو اُس کے چہرے پر خوشی بھی ناچ رہی تھی-(۲)
لیکن آخرِ کار افسانے کی پروٹیگنسٹ جس کا نام عائشہ ہے، وِسٹن اور اُس کی فیملی کے ساتھ ہی فلپائن میں کوڑھ کے مریضوں کی بستی میں رہتی

ہے، وہ وسٹن کو چھوڑ نہیں سکتی کیوں کہ اُس کے پاس کہیں اور جانے کا ذریعہ ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ عورت کا جو پہلا پیار اُسے وہ نہیں چھوڑتی۔ وہ اُس سے جان نہیں چھڑا سکتی۔ وہ وسٹن کے پاس ہی رہنا چاہتی ہے۔ وہ بہر طور اور ہر حال میں اور ہر قیمت پر اُس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اُس کے ساتھ ہے بھی اور نہیں بھی ہے اور یہ ایک لحاظ سے 'ایسٹ' اور 'ویسٹ' کا بھی ہے کہ ساتھ ساتھ بھی ہیں اور نہیں بھی ہیں۔ گرہ ارض پر مشرق اور مغرب ایک دوسرے کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ایک بہاؤ میں چل رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے متقابل ندی کے دو کناروں کی طرح تو ہیں مگر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ ایک ساتھ نہیں ہیں کیوں کہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد اور عورت مختلف خطوں سے ہیں کہ پروٹیگنسٹ مشرق سے ہے اور وسٹن مغرب سے ہے، اِس طرح دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ دو طرح سے الگ الگ ہیں، وہی فرق جو مشرق اور مغرب کے مابین ہے۔ جیسے رڈیارڈ کپلنگ کی نظم کا ایک ٹکڑا ہے:

''ایسٹ'' ایسٹ ہے اور ''ویسٹ'' ویسٹ ہے
اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے۔

یہ ندی دو کنارے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ موجود بھی ہیں اور ایک وقت کے بہاؤ میں چل بھی رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے۔ یہ ان کی منزل مقصود ہے کہ ایک دوسرے کے متقابل چل تو رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ وہ اِس لیے کہ 'ایسٹ' ایسٹ ہے اور 'ویسٹ' ویسٹ ہے۔ اِس حوالے سے دیکھیں تو وہ امتیاز ہمیں نظر آتا ہے کہ وسٹن کسی بھی موقع پر اپنی بیوی مارتھا اور اپنی فیملی کو چھوڑ کر عائشہ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا، یہاں تک کہ وسٹن کی فیملی کوڑھ کے مرض میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وسٹن کو اپنے گزشتہ کے عمل پر تھوڑا بہت پچھتاوا تو ہوتا ہے، لیکن وہ پھر بھی عائشہ کے ساتھ مربوط و منسلک نہیں ہوتا۔ یہی وہ امتیاز ہے، جہاں پر اورینٹل اور اوکسیڈینٹل کی یا وائٹ اور نان وائٹ نسل کی آپس میں جو ایک دوسرے سے ہمیشہ سے جو دُوری اور بُعد ہے۔ اُس کی جانب مصنف اشارہ کرتا ہے۔ اب یہاں مشرق اور مغرب میں جو فاصلہ ہے، اس حوالے دو اقتباس ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جو اہلِ مغرب کے ذہن و فکر کی اہلِ مشرق کے متعلق عکاسی کرتے ہیں، وسٹن جب واپس انگلینڈ پہنچتا ہے تو اپنے دوستوں کو اہلِ مشرق کے متعلق کیا کیا کہانیاں گھڑ کر سناتا ہے اور اہلِ مشرق کے متعلق ایک منفی فضا بناتا ہے:

لندن پہنچنے کے کچھ دن بعد جب وہ اپنے کلب گیا۔ تو وہاں موجود سبھی لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ عائشہ اب اُس کے

لیے وہ ناخوش گوار خواب بن چکی تھی، جسے بُھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے!

فرصت کے اوقات میں جان وسٹن اپنے دوستوں کو اِرد گرد جمع کیے اپنے سفر کے عجیب و غریب تجربے پوری تفصیل سے بیان کیا کرتا۔ وہ اُنھیں بتاتا کہ مشرقی ممالک کی زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ اُن لوگوں پر تو بھروسہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ جانے کب کیا کر بیٹھیں۔ ان ممالک میں زندگی ہمیشہ ہتھیلی پر لیے پھرنا پڑتا ہے۔(۷)

ایک اور موقع پر وسٹن نے عائشہ کے متعلق ایک اور نوعیت کی حامل حکمتِ عملی تیار کی تھی، لیکن ایک عورت اپنے پہلے پیار کو نفسیاتی طور پر نہیں بُھولتی۔ مارتھا سے جب عائشہ کی ملاقات ہوتی ہے تو مارتھا سب کچھ بھانپ جاتی ہے، لیکن وسٹن صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ ہی نہیں کر پاتا۔ وسٹن مشرقی عورتوں کے متعلق ایک بات کا اظہار اپنے الگ انداز سے کرتے جا رہا ہوتا ہے، لیکن وقت صورتِ حال دونوں اُس کے ساتھ ایک الگ نوعیت کا حامل کھیل کھیلتے ہیں۔ اِس ضمن میں ایک اقتباس توجہ کا متقاضی ہے:

دوپہر کے کھانے کے بعد جان وسٹن پھر کام پر روانہ ہوگیا۔ حکومت کی جانب سے ٹرین میں اُس کے لیے سیٹ ریزرو کی گئی تھی۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر وہ راستہ بھر عائشہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب عائشہ ایسی بُری عورت تو ہے نہیں۔ جب اُسے معلوم ہوگیا کہ اُس نے شادی کر لی ہے۔ اُس کے پانچ بچے ہیں۔ بیوی ہے تو وہ خود ہی خاموش ہو جائے گی۔ مشرقی عورتوں میں یہی تو خصوصیت ہے۔ آخر میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اِن ملکوں میں گزارا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ عورتیں کیا کچھ برداشت نہیں کر لیتیں۔

سارا راستہ وہ یہی سوچتا رہا۔ حتیٰ کہ سفر کے خاتمے پر جب وہ ٹرین سے اُترا تو اُس کا ذہن پھر ایک بار پُرسکون تھا، اُس نے سوچا کہ جنگ ختم ہو جائے تو ایک بار عائشہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے گا اور وہ دونوں مارتھا کے ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ عمارہ کی باتیں۔ تیل کے پائپ لائن کے زمانے کی باتیں!(۸)

'اجنبی کہانی' ایک ایسے افسانے کا عنوان ہے جس میں مارتھا اور عائشہ کی صورت میں بھی اور مغرب اور مشرق کے حوالے سے بھی دو الگ الگ خطوں کی الگ الگ صورتِ حال ایک دوسرے پر مرور ایام کے ساتھ کُھلتی ہے اور پھر یہ کہ ہر کہانی ہی 'اسٹرینج' ہوتی ہے۔ ایک قاری کے لیے تو کہانی 'اجنبی' ہوتی ہی ہے۔ جیسے جیسے کوئی اجنبی کُھلتا ہے، اُسی طریقے سے کہانی بھی اپنے قاری پر دھیرے دھیرے کُھلنا شروع ہوتی ہے اور اگر کوئی بھی افسانہ پہلی دو تین سطروں یا پہلے ہی پیراگراف میں اپنے آپ کو 'رویل' کر دے تو وہ تو کرافٹ ہی نہ ہُوا۔ اُس میں تو فنی چابکدستی ہی نہ ہوئی، اُس میں تو کوئی لُطف و انبساط کی آرٹ کی کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ ہر افسانہ کئی

ایک لحاظ سے قاری کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اُس کہانی کو پڑھتا جاتا ہے، اُسے جانتا جاتا ہے، اُس پر غور کرتا جاتا ہے، وہ اجنبی یا اسٹرینجر نہیں رہتی۔ اُس میں موجود مفاہیم قاری پر کھلتے جاتے ہیں۔ اُس کی مختلف جہتیں اور مختلف پہلو قاری پر آشکار ہوتے جاتے ہیں، لیکن زیرِ نظر کہانی میں ایک لحاظ سے کہ افسانہ نگار نے پہلے ہی فوکس کر دیا ہے کہ اُس کی پروٹیگنسٹ ایک عورت ہے اور عورت کی جو نفسیات ہے۔ آخر میں افسانے کا اختتام بھی اِسی پوائنٹ پر وہ کرتا ہے کہ عورت کی نفسیات کو کون سمجھا ہے!

اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جارج ساوا نے عائشہ کے اِس عجیب طرزِ عمل کو نفسیات کی روشنی میں معنی پہنانے کی کوشش بھی کی ہے اور وہ اِس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں، لیکن اُن تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے آخر میں مَیں صرف اِتنا کہوں گا۔ عورت کو آج تک کس نے سمجھا ہے---!(۹)

عورت کی جو نفسیات ہے، وہ اُس کی اپنی نفسیات ہے، خواہ وہ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی یا دُنیا جہان کے کسی بھی خطے کی وہ عورت ہو اُس کے بعض نفسیاتی معاملات مشترکہ ہوتے ہیں۔ اُس نے عائشہ کی نفسیات کے متقابل مارتھا کی نفسیات کو بھی پیش کیا ہے، لیکن جس مقام پر مارتھا افسانے کی پروٹیگنسٹ عائشہ کو جاتی ہے تو وہاں مارتھا ایک ماں ہے، ایک بیوی ہے، مارتھا ایک مغربی روایتی عورت ہے، اُس کے سارے رُوپ نظر آتے ہیں۔ اب یہاں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایک بُری عورت ہے۔ وہ ایک عورت ہے اور وہ اپنی اِقلیم کا دفاع کرتی ہے۔ وہ اپنے میاں اور اپنی فیملی کا دفاع کر رہی ہے، وہ اپنی اولاد کا دفاع کر رہی ہے، وہ اپنے گھر کا دفاع کر رہی ہے، وہ اپنے علاقے کا دفاع کر رہی ہے اُس کا جب عائشہ سے ٹاکرا ہوتا ہے تو وہ کئی ایک حوالوں سے اپنے مغرب اور مغربی روایات اور صورتِ حال کا دفاع کر رہی ہوتی ہے۔ وہ وہاں پر اپنے علاقے اور اپنی اِقلیم کا دفاع کر رہی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے شیرنی اپنے علاقے کو اور اپنے بچوں کا دفاع کرتی ہے۔ اینیمل انسٹنکٹ ایک عورت کی کیوں کہ وہ جو شیر صاحب ہیں، وہ تو کوئی خاص کام نہیں کرتے۔ شیرنی ہی اپنے شکار کے حوالے سے بھی مستعد اور فعال ہوتی ہے۔ یہاں پر مغربی عورت اپنی اقلیم اور اپنے تمام تر لوازمات و معاملات کا دفاع کرتی ہے اور دوسری طرف بھی ایک عورت ہے جو ہزاروں میل سفر کر کے آئی، لیکن چوں کہ دونوں عورتیں ہی ہیں، ایک اپنی ٹیریٹری کو ڈیفینڈ کر رہی ہے اور دوسری عورت ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آئی ہے۔ بنیادی طور پر وہ 'آوٹ آف لَو'، وہ اپنی پہلی محبت کی متلاشی بھی ہے اور اُس نے ایک پروسٹیٹیوٹ کے طور پر جو کلفتیں اُٹھائی ہیں، وہ بھی اُس کی زندگی کی ایک سیاہ، بھیانک اور خوف ناک تصویر ہے۔ اُس نے محض ایک بندے (وشن) کی وجہ سے سفر کیا ہے اور مصائب کو جھیلا ہے اور خوف ناک مسائل کا سامنا کیا ہے، جس

سے پیراڈوکسکلی وہ نفرت بھی کرتی ہے اور اُس سے وہ محبت بھی کرتی ہے۔ اب یہ بڑی عجیب و غریب چیز ہے کہ یہ کیا ہے؟ کیا ہم اِسے ایک عورت کے پرسپیکٹیو سے ہی دیکھیں کہ ایک عورت، ایک مرد سے محبت کرتی ہے، خواہ وہ وائٹ ہے یا نان وائٹ ہے، کسی سے علاقے سے تعلق رکھتا ہے، وہ اُس کو بھول نہیں سکتی اور وہ اُس کے لیے ہزاروں میل کا سفر کر کے آ گئی ہے۔ اُس پرسپیکٹیو سے دیکھیں یا ہم اورینٹل کی اوکسیڈینٹل کے لیے تڑپ کو یا اُس کی طرف رُجوع کو دیکھیں، ہم عائشہ کو صرف ایک عورت عائشہ کے طور پر دیکھیں یا عائشہ کو ایک مشرقی عورت کے طور دیکھیں! اُس کو اورینٹل پرسپیکٹیو میں دیکھیں! یا اورینٹل کسی حوالے سے اوکسیڈینٹل کے ساتھ ملنا چاہتا ہے؟ اُس کے ساتھ 'ایٹ پاور' ہونا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست بات ہو سکتی ہے کہ کس پرسپیکٹیو سے اِن سارے عناصر و عوامل کو لیا جائے۔ اس افسانے کو اگر محض ایک عورت کے پرسپیکٹیو سے دیکھتے ہیں تو وہ تو اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن اِس کہانی سیکنڈری اہمیت یا ثانوی اہمیت وہ مشرق اور مغرب کا ملاپ اور ایک دوسرے سے دُور ہونا اور ایک دوسرے کے متوازی و متقابل چلنا بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

کہانی کے آغاز میں جو ڈاکٹر جارج ساوا کا کردار ہے، کیا وہ حقیقت سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا وہ کردار تاریخ کے کسی ورق پر موجود تھا یا وہ مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے؟ یا وہ کسی شخص کا فکشنل اکاؤنٹ ہے؟ اُس کی تھیمیٹکی کیا اہمیت بنتی ہے؟ ڈاکٹر جارج ساوا برطانوی سرجن اور پروفیشنل رائٹر تھا، جس کا اصل وطن روس ہی تھا۔ ڈاکٹر جارج ساوا 1903 میں پیدا ہوا تھا اور اُس نے برطانیہ میں 1996 میں انتقال کیا تھا۔ اب کہانی کا جو چلار ہے، اُس میں ڈاکٹر جارج ساوا اِس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اُس کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے اور اُس کی مختلف شکلیں قاری کے سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر جارج ساوا کون ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک روسی ہے اور رشین علاقہ جو ہے، وہ یوریشیا کا علاقہ ہے اور وہ ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے، جہاں یوروپین کلچر بھی ہے اور حاوی بھی ہے اور مذہب بھی مسیحیت یعنی کرسچینٹی ہے۔ کرسچینٹی ایک رُوپ رشین اور تھوڈوکس ہے، لیکن جو روسی علاقہ ہے، اُس کم وبیش ساٹھ فیصدی علاقہ جو ہے، وہ ایشیا پر مشتمل ہے اور وسطی ایشیا اور روس کا وہ علاقہ جو چائنہ کے ساتھ لگتا ہے، روسی بندرگاہ 'ولڈی واسٹوک' چائنہ کے ساتھ جا لگتی ہے۔ یہ خاصا بڑا علاقہ ہے جو حاوی نظر آتا ہے۔ اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ ڈاکٹر جارج ساوا کیا واقعی کوئی جیتا جاگتا کردار تھا یا یہ ایک تخیلاتی کردار ہے؟ کیا یہ ایک امیجنری کردار ہے؟ اور اگر امیجنری کردار ہے تو موڈل کس پر کیا گیا ہے؟ اس کردار کو کس جیتے جاگتے کردار پر بیس کیا گیا ہے؟ اگر کیا گیا ہے۔

[جاری ہے۔]

شفیق احمد خان.....منفرد اسلوب کا باکمال شاعر

کتاب زیست میں حرف زیاں نہ ہو جاؤں
مجھے یہ ڈر تھا کہیں رائیگاں نہ ہو جاؤں

.....

علم ایک ایسا گوہر نایاب ہے جس کی وجہ سے انسان کو فرشتوں پر فضیلت عطا کی اور اشرف المخلوقات ٹھہرا، قرآن مجید کا پہلا لفظ جو رب تعالیٰ نے نازل کیا وہ اقرا تھا یعنی پڑھ ارشاد ہوتا ہے کہ جس کو علم عطا کیا گیا اس کو خیرِ کثیر عطا کی گئی۔ قوموں کی ترجیحات میں علم صفِ اول رہا وہی دنیا کو فتح کرتی رہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اُن اقوام نے دنیا پر راج کیا۔ ایک عالم ہزار عابدوں پر بھاری ہوتا ہے۔

اس عہد کا مقصد یہ ہے کہ آج کل کے دور ناہنجار کے دگرگوں حالات میں ہمارے درمیان کسی صاحبِ علم کا موجود ہونا ایک نعمتِ غیر مترکبہ سے ہرگز کم نہیں ہے ہم جب بالعموم اپنے معاشرے اور بالخصوص عہدِ حاضر کے ادبی منظرنامے پر براجمان صاحبان کو دیکھتے ہیں تو ہمیں زیادہ حوصلہ افزا صورت حال کا سامنا نہیں ہوتا صرف چند احباب ہی صاحبانِ علم اور صاحبانِ بصیرت نظر آتے ہیں ان چنیدہ احباب میں جو شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ پروفیسر شفیق احمد خان کی ہے۔ شفیق احمد خان پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ مسندِ علم و ادب کی تکریم بڑھانے میں پوری تندہی سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں انھوں نے صلہ و ستائش کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر علم و ادب کے لیے وقف کر رکھا ہے یہ خاموشی سے اپنا ادبی کام کیے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی لگن محنت اور خلوصِ نیت کی وجہ سے تمام ادبی حلقوں میں ان کو نہایت عزت و تکریم کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ شفیق احمد خان ایک وسیع المطالعہ شخصیت کے حاصل ہیں نظم و نثر دونوں پر ان کو بلا کی دسترس حاصل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ پچھلے تیس سالوں میں اردو نظم و نثر کی کوئی بھی قابلِ ذکر کتاب آئی ہو اور وہ شفیق احمد خان کی نظروں سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے علوم پر بھی ان کی گہری نظر ہے چاہے وہ رشین ہو، جرمن ہو، فرانسیسی ہو، انگلش ہو یا دنیا کے کسی اور خطے کا ادب ان کے مطالعہ کا

فیصل زمان چشتی

حصہ ضرور رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے تجزیے اور ان کی تنقیدی بصیرت کا ایک زمانہ معترف ہے اور ہر تخلیق کار کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن پارے پر شفیق احمد خان لب کشائی کریں۔ کیونکہ ان کی بات اور تجزیے بے لاگ ہوتے ہیں اور وہ نہایت ایمانداری سے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ چاہے کوئی اس سے ناراض بھی ہو جائے مگر وہ کسی رعایت سے کام نہیں لیتے اور محاسن اور معائب پورے خلوص اور دیانتداری سے بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ تنقید برائے اصلاح کی ہے کسی بھی نثری یا شعری مجموعہ پر ان کا اظہارِ خیال اس کی صحت پر مہر ثبت کر دیتا ہے اور اسی علمی دیانتداری کی وجہ سے ان سے کئی دوست ناراض بھی ہوئے مگر ان کا یہ موقف ہے کہ دوست کو خوش کرنے کے چکر میں وہ علمی بددیانتی کے مرتکب نہیں ہوں گے آج کل کے دور میں اتنی راست گو اور اپنے کام کے ساتھ کمٹڈ شخصیات بہت کم کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اللہ پاک ان کو مزید استقامت عطا فرمائے کیونکہ اردو ادب میں شفیق احمد خان جیسے دیانتدار، غیر جانبدار، جرأت منداور بے باک نقاد کا موجود ہونا اردو ادب کی خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے ان کی علمی و تنقیدی بصیرت کا ایک زمانہ معترف ہے اور یہ عہدِ حاضر کی جید اور مستند و معتبر شخصیات میں شامل ہیں مگر اپنی انکساری بردباری اور ملنساری کی بدولت اپنے جونیئرز کو اس بات کا احساس تک نہیں ہونے دیتے اور یہ غیر معمولی بات ہے۔

شفیق احمد خان پچھلی چار دہائیوں سے زائد عرصہ سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں اور بڑے اعلیٰ پائے کی شاعری کر رہے ہیں ان کی شاعری میں دکھ کرب نفسیاتی و جذباتی کیفیات اپنے بام عروج پر نظر آتی ہیں:

غم کے دریا میں اُتر جانے کا موسم آیا
پھر سے چپ چاپ بکھر جانے کا موسم آیا

دل پہ اک درد کی زنجیر پڑی ہے اب بھی
کب کسی زخم کے بھر جانے کا موسم آیا

.....

ان کی شاعری حسن اور خوبصورتی سے عبارت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دلی جذبات اور غم و اندوہ کی کیفیات بیان کرنے میں بھی ان کا جواب نہیں ان کے اشعار سن کر دل و دماغ کی کیفیتیں تبدیل ہو جاتی ہیں اور زندگی کی تلخ حقیقتیں ہمارے سامنے مجسم پھیلائے موجود ہوتی ہیں کچھ لوگ صرف لفظوں کے جادوگر ہوتے ہیں، مگر شفیق احمد خان الفاظ کے جادوگر ہونے کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کو تہ بوکرنے کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔

عجیب رت ہے کوئی رائیگاں اداسی کی
میں لکھ رہا ہوں ابھی داستاں اداسی کی
یہ دل کا درد میری چشم تر میں آ نکلا
کسی سے میں نے بھلا کب بیان اداسی کی
میں جب سے پیدا ہوا ہوں اداس پھرتا ہوں
کسی نے کان میں دی تھی اذاں اداسی کی

.....

کسی شاعر کے لیے صاحب اسلوب ہونا بہت بڑی کامیابی ہوتا ہے اور اس کی شاعری کی معراج بھی۔ اس کے لیے یکسوئی اور ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آجکل شعری مزاج میں کلاسیک

کی روایت اپنی پوری طاقت کے ساتھ نظر آتی ہے ان کے الفاظ اپنے ہیں ان کی تراکیب کمال کی ہیں ان کی سوچ و فکر منفرد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موضوعات کے تنوعات ان کی شاعری کو اعلیٰ وارفع بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں غم، اُداسی سکوت، فسوں، افسوں، خواب، ملال، زیاں، موسم، جنوں، شہر ستم، بکھرنا، چشم تر، درد، ہجر وغیرہ الفاظ بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔

شفیق احمد خان اپنی غزلوں میں اتنی خوبصورت اور برمحل تراکیب استعمال کرتے ہیں کہ کمال ہو جاتا ہے لگا تار اور منفرد معنویت کی حامل تراکیب ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ اپنے ذوق وشوق کی وجہ سے انھوں نے کمال یک شاعری اتنی پڑھ رکھی ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

خوبصورت اور با مقصد سوچ و فکر کے ساتھ مصرعے کی بنت باکمال اور مرصع الفاظ سے مزین شاعری میں احساس درد اور کرب کا پرتو ان کے اشعار کو پُرتاثیر بناتا ہے جو صاحبانِ احساس و فکر کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے:

شہر والوں سے جدا تھے شہر میں رہتے ہوئے
کٹ گئی ہے عمر غم کی لہر میں رہتے ہوئے
رفتہ رفتہ تلخ سے ہم تلخ تر ہوتے گئے
روز و شب اک بے بسی کے زہر میں رہتے ہوئے

.....

اس پیکرِ گل رنگ پہ مرتے کوئی دن اور
اک غم کے تسلسل میں گزرتے کئی دن اور
اچھا تھا شفیق اپنی اداسی کے فسوں سے
ہم خاک کی صورت میں بکھرتے کئی دن اور

.....

ان کا استعاراتی نظام مضبوط بنیادی پر قائم ہے ان کے مصرعے اتنے مضبوط اور جاندار ہوتے ہیں کہ قاری کا دل اس کی مٹھی میں آ جاتا ہے۔ شفیق احمد خان کو صحیح معنوں میں منفرد اسلوب اور خوبصورت لب و لہجے کا شاعر کہا جا سکتا ہے، مگر یہ لاحقہ آجکل ہر شاعر کے ساتھ لگ رہا ہے اور ان ناموں کے ساتھ بھی جن کو اس کے مطلب کا بھی نہیں معلوم شفیق احمد خان سرتاپا شاعر ہیں ان کے زبان و بیان سے علم اور شاعری جھلکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صاحبانِ علم و فن کی زندگی ہمیشہ دنیاوی آلائشوں سے پاک رہی ہے اور شفیق صاحب نے بھی ساری زندگی اسی سنت پر عمل کیا ہے۔ حقیقی شاعر صوفی اور درویش ہوتے ہیں اور شفیق صاحب نے بھی اپنی پوری زندگی اس کڑے معیار پر پورا اترنے کی کوشش میں گزار دی ہے جو کہ اس مادہ پرستی کے عہد میں ایک معجزہ ہی نظر آتا ہے۔

پھر سے روشن یہ ستارا نہیں ہونے والا
عشق اب مجھکو دوبارا نہیں ہونے والا
کارِ بے سود ہے تجدیدِ مراسم کی طلب
وہ کبھی پھر سے ہمارا نہیں ہونے والا
کھو دیا تم کو ہر اک خوف سے آزاد ہوا
اب مجھے کوئی خسارا نہیں ہونے والا

.....

اب تک ان کے آٹھ نظم و غزل کے مجموعے شائع ہو کر اہلِ زبان و ادب سے داد و تحسین سمیٹ چکے ہیں اور نواں مجموعہ "دروازۂ شب" جو طویل نظم پر مشتمل ہے اشاعت کے مراحل میں ہے ان کے تمام شعری مجموعوں میں شدت احساس کرب، وسعت، رفعت اور گہرائی اپنے اوج کمال پر نظر آتی

ہے۔ اذیتِ غم، اداسی اور رائیگانی کا احساس ان کی شاعری کے جزوِ ضروری ہیں:

خوف سے دل میں سمٹ جانے کا موسم آیا
پھر ترے غم سے لپٹ جانے کا موسم آیا
آ گہی ہے کہ صلیبوں کی طرف کھینچتی ہے
وقت کی تیغ پہ کٹ جانے کا موسم آیا

.....

انھوں نے زمانے کا جبر اور اپنی ذات کا دُکھ اکٹھا بیان کیا ہے ہر فطری تخلیق کار کی طرح ان کی شاعری میں بھی بے ساختگی اور رنج و ملال کی کیفیتیں جا بجا نظر آتی ہیں اور یہ اتنی پُر تاثیر ہیں کہ قاری تادیر ان کے سحر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ان کی شاعری ایسی پینٹنگ ہے جس میں تصویر حرکت کرتی ہے اور رنگ بولتے نظر آتے ہیں:

دل میں سب انجم و مہتاب بکھر جاتے ہیں
آنکھ کھلتی ہے تو سب خواب بکھر جاتے ہیں
جب بھی آ جائے کبھی اپنا مقابل کوئی
جنگ سے پہلے ہی اعصاب بکھر جاتے ہیں
غم گرا دیتا ہے اک روز فصیلِ جاں کو
زیست کرنے کے بھی اسباب بکھر جاتے ہیں

.....

ان کی شاعری انفرادی کرب اور اجتماعی محرومی کی تکالیف اور رشتوں کے تقدس کی پامالی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی بھی مظہر ہے، جس سے ہمارے سماجی اور معاشرتی رویے بھی بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک اعلیٰ پائے کی شاعری کا لازمی جزو تصور کیے جاتے ہیں انھوں نے پوری زندگی دکھ اور غم کے ساتھ بسر کی ہے لیکن کبھی بھی دکھ اور غم ان کی اُمید اور خوابوں پر حاوی ہوتا ہوا نظر نہیں آیا یہی وجہ ہے کہ ان کا حوصلہ اور ہمت جوان رہتی ہے اور وہ خود کو اور اپنے قاری کو نئی منزلوں کے راستے اور نئے امکانات کے سورج دکھا رہے ہوتے ہیں۔ شفیق احمد خان کی شاعری ایک ایسا سمندر ہے جس میں غوطہ زنی کے بعد آپ کے ہاتھ میں سوچ و فکر و رعنائی کے وہ موتی آتے ہیں جس سے زندہ رہنے کا جذبہ اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔

مشقت کرنے کے لیے توانائی بھی بڑھ جاتی ہے اور قاری ان جہانوں کی سیر بھی کر لیتا ہے جو ابھی صرف امکانی حد تک ہوتے ہیں مگر ان کی شاعری میں موجود حسِ لطافت رنگ و رعنائی اور اس میں نہاں روحانی بالیدگی، ذہنی آسودگی اور خوشبوئے بیاں سے ایک عرصہ تک مشامِ جاں معطر رہتی ہے۔ شفیق احمد خان کی شاعری سے فہم و ادراک اور شعور و آگہی کے کئی در کھلتے ہیں اور ان کو ایک مضمون یا ایک نشست میں بالکل سمیٹا نہیں جا سکتا میرے خیال میں کئی جگہوں پر اور کئی پہلوؤں سے بہت تشنگی رہ گئی ہے۔ لیکن مضمون کی طوالت کے سبب یہیں پر اختتام کرتا ہوں:

عجیب طور کی وحشت تھی آب و تاب کے ساتھ
میں تجھ کو ڈھونڈ رہا تھا دلِ خراب کے ساتھ
کہیں کا چھوڑا نہیں بے یقین سجدوں نے
گناہ بڑھتا گیا کوششِ ثواب کے ساتھ
شفیق اب بھی گزرتے ہیں روز و شب اپنے
کبھی کتاب سے چہرے کبھی کتاب کے ساتھ

☆☆☆☆☆

خالد احمد کی غزل میں پاکستانی سماج کی پیشکش ___ (مختصر جائزہ)

خالد احمد اُردو زبان کا ایک بڑا نام ہے۔ خالد احمد کی غزل میں بیان و بدیع کے جملہ مظاہر موجود ہیں۔ خالد احمد پورے یعنی سرتاپا شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہر رنگ ملتا ہے، جسے شعرا نے موزوں کرنے کی کوشش کی ہے۔ خالد احمد کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ قاری پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ خالد احمد نے زندگی کے جملہ حوادث کو بڑے حوصلہ کے ساتھ سہا ہے اور اس کے تاثرات کو نظم بھی کیا ہے۔

خالد احمد کی شخصیت اور شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ منیر نیازی، باقی صدیقی، حزیں صدیقی، ساغر صدیقی، قیوم نظر کے متوازی ان کا نام لاہور کی ادبی فضا میں گونجتا رہا۔ منیر نیازی کے اثر و رسوخ خالد احمد سے زیادہ ادبی حلقوں میں تھے، اس وجہ سے انھیں زیادہ پڑھا، سُنا اور سکرین پر دکھایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالد احمد نے صنفِ غزل کے علاوہ نظم، رباعی، قطعات، مسدس، ترجیع بند، مراثی اور گیت نگاری میں کمال دکھایا ہے۔

خالد احمد نے جس دور میں آنکھ کھولی۔ وہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ تب پاکستانیت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ایک نیا ملک وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ ہر چیز کو تبدیل کیا جا رہا تھا۔ سیاست میں عجیب و غریب حرکات جاری تھیں۔ معاشرے کی کہنہ روایات کو نئے سرے سے متعارف کروایا جا رہا تھا۔ تہذیب و تمدن کی نئے سرے سے تفہیم کی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ تھا جو پاکستانیت کے نام پر

محسن خالد محسن

بدلا، کچلا، روندا، اور تباہ کیا جا رہا تھا۔ مذکورہ حالات وواقعات کو ایک حادثہ سے کم نہ سمجھا گیا جس پر اس دور کے نبض شناسوں نے کھل کر لکھا اور اپنے تئیں اس بدلاؤ کے خلاف قلمی جہاد کیا جس میں خالد احمد پیش پیش رہے۔

شاعر کا کام ہی معاشرے کی نک سکھ درست کرنا ہے اور اس کے رُخ کو متعین کرنا ہے۔ اب یہ کام سوشل میڈیا کر رہا ہے۔ پہلے یہ کام شعرا، ادبا اور نقادِ ادب کرتے تھے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمیں حکمران ایسے میسر آئے ہیں جنھوں نے اسلام کے نام پر ہر چیز کو اسلامک ٹچ سے لیس کرا اپنے مفادات کو عزیز رکھا اور ہماری اسلامک تھاٹ کو بُری طرح کُچل ڈالا۔

خالد احمد وجیح گھرانے سے متصل تھے۔ انھیں یہی سکھایا گیا تھا کہ اتحاد، یگانت، رواداری اور ملنساری ہی انسانوں کا تعارف ہوتی ہے۔ نفرت، نفاق اور مفاد پرستی کے حامل انسان کی سماج میں کوئی قدر نہیں۔ خالد احمد نے اپنی سوچ، تفکر اور تدبر کو اشعار میں بیان کر کے اپنے سُلگتے جذبات کا اظہار یوں کیا:

کس رنگ کے موسم ہیں، کس رنگ کے ماتم ہیں
ہر رنگ خبر گشتہ، یا آپ ہیں، یا میں ہوں

پُرسانِ حال کون ہے، اپنا ترے سوا
ہم لوگ کس کے نام پہ کسب نمو کریں

نم یہ آنکھیں بھی نہیں! ہم بھی گلو گیر نہیں!
آج تارے بھی دُھواں، اے صف مژگاں کیوں ہیں؟

اے رائندہ دُنیا تجھے کیا غم کہ مجھ ایسے
پروردہ دُنیا کو بھی راس آئی نہ دُنیا

زندگی کربلا سے گزرے گی
دیکھ لینا! قضا نہ ہو جائے

خالد احمد نے آمریت کے دور سیاہ کو بھی دیکھا اور اس کے خلاف بھی لکھا۔ خالد احمد کے شعری مجموعوں ''دراز پلکوں کے سائے سائے، نم گرفتہ، پہلی صدا پرندے کی، ایک مٹھی ہوا، پہلی پُو، پہلی پُروائی، ہتھیلیوں پہ چراغ'' میں اپنے زمانے کی صورت حال کے خوبصورت مرقعے ملتے ہیں۔ انھوں نے عمرِ عزیز کو محبوب کی بانہوں میں اسیر رہ کر گزارنے پر ترجیح نہیں دی بلکہ اپنے تئیں شعور کی آنکھ کو کھلے رکھنے پر قناعت کی اور سماج میں پروردہ نفاق انگیز اثریت کو نظم ونثر کے ذریعے سُدھار پر اُستوار کرنے کی کوشش کی۔

خالد احمد کا نکتہ نظر اپنے زمانے کے شعرا سے یکسر مختلف تھا۔ ان کے ہاں پاکستان سے محبت سب سے بڑا جذبہ بن کر سامنے آتا ہے۔ خالد احمد نے اپنی نظموں میں سماج کی ارزانی کے تصور کو جس انداز سے واضح کیا ہے وہ بھی دیکھنے اور سراہنے کی چیز ہے۔ خالد احمد کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے شعور کی بنیاد اخلاقیات،

سماجیات اور اتحادیات پر رکھی گئی تھی۔ انھیں جس طرح کا ادبی، تعمیری اور یگانتی ماحول میسر آیا۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ خالد احمد نے عمر بھر خون نہیں تھوکا بلکہ خون کی ندیوں کو نگاہوں کے سامنے بہتے ہوئے دیکھا ہے اور خود بھی خون خون ہو کر رہے۔

کچھ بجھائی نہیں دیتا پسِ دیوارِ بکا
کون سنتا ہے ترے خیرہ سروں کا رونا

ہم نے ہر ہاتھ نئی صبح کا رستہ دیکھا
عمر بھر روئے فقط راہ گروں کا رونا

زندگی کی دلدلوں میں زندگی دھنس جائے گی
شہر مٹی کے سمندر میں اسارے جائیں گے

ہم سے قیامتیں چلیں، ہم سے ملامتیں چلیں
ہم ہی غبارِ بے نشاں، ہم ہی شکارِ سنگ بھی

.....

خالد احمد کا تصورِ زیست بھی عجب درد لیے ہوئے ہے۔ خالد احمد پاکستانی معاشرے کے دوہرے معیار اور منافقانہ طرزِ احساس سے بہت عاجز تھے۔ انھوں نے زندگی کو خوبصورت لمحوں کا اسیر دیکھا تھا جبکہ حقیقتاً صورتحال یکسر متضاد تھی۔ خون کی ہولی آمروں نے کھیلی۔ جمہوریت کا جنازہ نکال دیا۔ معاشرت کا بیڑہ غرق کیا گیا۔ باہمی اتحاد کا فلسفہ لایعنی اور بے کار و مردود متصور ہوا۔ کوئی ایک اکائی ایسی نہ تھی جس پر اس دور کے سیاہ بادلوں نے بارشِ زحمت نہ برسائی۔

خالد احمد کے ہاں معاشرے کی مجموعی ارزانی اور تنزلی کا بیان جس کرب، اذیت اور تکلیف سے ہوا، یہ آپ ان کے شعری مجموعوں میں جابجا پڑھ کر محسوس کر سکتے ہیں۔

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دُنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

ہچکیاں، سسکیاں تمام ہوئیں
اور اب سسکیوں کی باری ہے

فصل تو نے بوئی تھیں، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِ نظر تک لہلہاتی دوریاں

.....

خالد احمد نے وقت کے دوراہے کو اپنے اختیار سے متجاوز ہوتے بارہا محسوس کیا ہے۔ انھوں نے غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غمِ روزگار میں اسیر ایک زمانے کو اپنے در سے تسکین و تسلی اور امید کے تصور سے بارور کیا ہے۔ خالد احمد کی چوکھٹ پر جو بھی آیا وہ فیض لے کر گیا۔ ان کے دوستوں، احباب اور تعلق داروں میں کوئی ایسا نہیں جو ان کے رویّے کا شاکی ہے۔ خالد احمد کی شخصیت میں درویشی عنصر بدرجہ غایت موجود تھا۔ ان کے سیکڑوں شاگردوں نے ان سے تفکر و تدبر کی خیرات لی۔ اس کے باوجود خالد احمد کی درویشی اور قناعت پسندانہ طرزِ فکر میں ملاوٹ کا عنصر دخیل نہ ہو سکا۔ یہ اپنی وضع کے آدمی تھے اور اسی وضع میں حیات کو تمام کر گئے۔

کتنی مشکل سے کوئی لفظ گہر ہوتا ہے
کتنے سینے صدفِ آہ و بکا رہتے ہیں

زندگی کے ہاتھ میں تو ہاتھ دے دیں گے مگر
وحشتوں کے پاؤں میں کیا خاک پہنائیں گے

کسی کی جیب میں پیسے نہیں تھے
کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا

کسی کے پاس کسی کے لیے یہاں کیا ہے
یہ کور چشم مرے وارثوں کے ساتھی ہیں

.....

خالد احمد نے پاکستانی سماج کو شدید جذباتیت اور ذہنی خلجان میں مبتلا دیکھا۔ پاکستان کے سماج میں خرابیوں کا ایک جہان آباد ہے۔ یہ قوم عجیب و غریب ہے۔ اس نے سیکڑوں حکمرانوں کو حکمران بننے کی دعوت دی اور خود کو ان کا مطیع اور تابع فرمان غلام بننے پر مہمیز کیا۔ محمد بن قاسم کی آمد سے لے کر انگریزوں کے جانے تلک، یہاں کے باسیوں نے ہر آنے والے خوش آمدید کہا اور جانے والوں کو، گو کے نعرہ سے خدا حافظ کہا۔ اب بھی یہی روش پوری طرح اس سماج کے پروردہ اذہان میں کارفرما ہے۔ خالد احمد اس سطحی، دقیانوسی اور جہل پر اُستوار سوچ کے خلاف تھے۔ یہ کہتے تھے کہ انسان بھوکا رہ سکتا ہے، قانے کاٹ سکتا ہے، جان سے جا سکتا ہے لیکن غلامی کو گوارا نہیں کر سکتا۔

کتنے فاقوں کے جلو میں کتنی صدیاں بیت گئیں
لیکن پرجا بھول نہ پائی قصہ راجا رانی کا

کتنی صبحیں کالی کر دیں، کتنے بال سفید کیے
خون کی آگ میں جلتے کاغذ آتش دانوں سے نکلے

تیز ہوا کے پیچھے پیچھے مہکاروں کے لشکر رہے
خون وہ پھول تھا جس کو جہاں بھی جس نے بکھیرا پھیلا گیا

.....

خالد احمد نے جس طرز احساس کو اپنائے رکھا، وہ درویشی، قناعت پسندی اور تفکر و تدبر کی حکیمانہ روش تھی۔ خالد احمد کے ہاں ہر طرح کی آسائش میسر ہونے کے ذرائع ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے قلم کو فروخت نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے آقاؤں کے لیے مدلل مداحی نہیں کی۔ انھوں نے اپنی فکر کو اور اپنے شعور کو سمجھوتے کی بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ اپنی رائے کا اظہار کیا اور اس طور سے کیا کہ مخالفین انگشت بدنداں رہ گئے اور بہت کچھ کر سکنے کے باوجود بھی دم بہ خود جامد رہے۔

رائے ہم دیں بھی تو کس بات پہ کس برتے پر
جب نہ ہونے کے برابر ہو ہمارا ہونا

اب لہو بن کے بھٹک تو میری شریانوں میں
اے گماں، تو نے یہ امکاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

زہر بن کر نہ رگ و پے میں اُتر جائیں کہیں
سانس بن کر مری سانوں میں اُترنے والے

.....

شاعر اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔ ایک انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے اثر لیتا ہے۔ اس کی شخصیت اور تفکر پر اپنے ماحول، معاشرت اور سماج کے جملہ اطوار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ خالد احمد

نے جس سماج میں آنکھ کھولی تھی۔ وہاں ہر اُس برائی اور تباہ کاری کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر داستانوں کے ولن کرداروں کے ہاں پڑھنے کو ملتا ہے۔ پاکستانی معاشرت کو شروع دن سے اپاہج اور معذور پیدا کیا گیا تھا۔ اس ملک کے بنانے والوں نے اس کو ایسا بننے پر مجبور کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی نوبت نہ آئے بلکہ یہ خود ہی ایسا کمزور، ناتواں اور سبک رہے کہ بادِ مخالف کے زمل تمانچے سے اس کے گالوں سے خون کی پھواریں پھوٹ پڑے۔

بھوک، ننگ، افلاس اور ادبار سے معمور اس سماج میں ایک شاعر اپنے دُکھوں کا رونا کیا روئے گا۔ وہ جہاں دیکھتا ہے اُسے اپنا آپ دکھائی دیتا ہے۔ سماج کے غم اُس کے غم ہیں اور اُس کا غم کسی کا غم نہیں ہے۔ خالد احمد نے عمر بھر جہادِ قلم کا فریضہ جاری رکھا۔ خالد احمد کے ہاں ماتمی فضا کی صورتحال اسی منظر کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ جہد عمر بھر کا ہے دو چار دن کی بات نہیں ہے۔

اے صفِ ماتم ٹھہر! اے مجلسِ گریہ سنبھل!
تازہ دم، تازہ نفس، تازہ رثا آنے کو ہے

آگ تاپی عجب، عمر بھر بے طلب
جل بجھے اور اُٹھا دُھواں بھی نہیں

فاقے ہیں ہمیں گھر سے نکلنا نہیں آتا
آنسو ہیں مگر ہم پسِ دیوارِ رثا ہیں

جوگ کے پاؤں میں چکر رکھنا دُنیا داری کا
تن سے کھینچ کے تار نہ کر دیں، یار قبائے تار

خالد احمد کی شاعری دراصل ایک میزان ہے جس میں پاکستانی سماج اور معاشرت کے جملہ کرتوت کو رکھ کر تولا جائے تو صفر بٹا صفر نتیجہ نکلتا ہے۔ خالد احمد نے جس بغاوت کو ہوش و حواس کے ساتھ قبول کیا تھا، اُسے عمر بھر پوری ایمانداری، خلوص اور نیک نیتی سے نبھایا ہے۔ اس کی سزا انھیں ملی ہے اور بہت کڑی ملی ہے۔ ایک خوبصورت، مثالی اور لائقِ تقلید شاعر کو اس سماج نے نظر انداز کر دیا۔ آج کے سوشل میڈیا دور میں کوڑی کے بھاؤ بکنے والے شعرا کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے جبکہ ایک ایک شعر کو موتیوں کے بھاؤ فروخت نہ کرنے والے خالد احمد کا نام دور، دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ یہ نا اُمیدی کی بات نہیں بلکہ یہ پاکستانی سماج کی ارزانی تفکر کی بات ہے۔ یہ ارزانی زیادہ دیر باقی نہ رہے گا۔

لوگ مبہوت کھڑے ہیں سرِ بازارِ رضا
اے خدا، سوت کی اٹی سری قیمت کر دے

وہ دن دور نہیں رہے۔ موسم آئے گا اور بیج جڑ پکڑے گا۔ خالد احمد خود اپنے وقعت و اہمیت بتا گئے ہیں کہ ان کی ذات و شخصیت اور کلام کے بارے میں لوگ کیا رائے رکھتے ہیں اور وہ خود کو اس سماج کے سامنے کس طرح پیش کرتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ ان کا کہا ہوا حرف حرف مبنی بر حقیقت ہے اور حقیقت کبھی بطلان سے زیر نہیں ہوتی۔

ڈوب پائے نہ کبھی میرے سخن کا تارا
اے خدا، میرے دکھوں کو مری طاقت کر دے

☆☆☆☆☆

دو کتبے! [پورا سچ]

کہتے ہیں کہ انسان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا اس جہان سے ناطہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے لواحقین کے پاس مرنے والے کی صرف یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ بات اب کہ احساسات اور کیفیت قلبی کی ہے کہ جو شخص اس دنیا سے جا رہا ہے وہ آپ کو کتنا عزیز ہے اور آپ کے ساتھ گزرے اس شخص کے شب و روز آپ کے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کتنا پیار کرتے ہیں اس شخص سے تو ان سارے احساسات، جذبوں اور اس شخص کے ساتھ آپ کی رفاقت کے تمام لمحات آپ کے دل و دماغ میں ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے بابا جناب کوکب سرحدی (مرحوم و مغفور) کی جب رحلت ہوئی تو ہم دس برس کے معصوم بچے تھے۔ آج ان کو اس جہان فانی سے گزرے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہماری حیات کے ابتدائی دس سالوں میں ہمارے جنم داتا نے ہمیں جو پیار اور شفقت عطا کی بچپن کے وہ سارے واقعات و لمحات ہمیں ازبر ہیں۔ اور ہم آج تک ان کے ہاتھ کا لمس ابھی تک نہیں بھولے، جس ہاتھ کی انگلی سے انھوں نے ہمیں چلنا سکھایا، اسی طرح جب برادر بزرگ فاروق بابر آزاد نے بابا کی وفات کے بعد ہمیں اپنی رفاقت میں لیا اور بابا سے بڑھ کر ہم سے محبت کی انھیں یہاں سے گئے دو تین سال ہی ہوئے ہیں مگر ہمیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور اسی طرح ہماری رہنمائی فرماتے ہیں اور جیسے ہم سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہوں کہ:

کب تک میرے لہجے کے تاثر سے بچو گے
تم خود بھی کسی دن میری آواز بنو گے

....

نیئر سرحدی

ہمارے خان لالہ ایک عظیم انسان تھے اور اوصاف حمیدہ کے مثالی پیکر، ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایک جان دو قالب بن کر رہے، کون سی گھڑی کون سا لمحہ اور کون سی ساعت ہے کہ ہم خیالوں ہی خیالوں میں ان سے ہم کلام نہ رہتے ہوں، ہم اب بھی کسی لطیفہ یا مزاح کے موقع پر قہقہہ بلند کرتے ہیں تو اس قہقہے میں ان کی جاندار آواز بھی گونجتی سنائی دیتی ہے۔ بہرحال اسی تاثر اور کیفیت کے تناظر میں آج ہم وطن عزیز کے ایک مایہ ناز شاعر وادیب، کالم نگار اور صحافی جناب خالد احمد کے بارے میں بلند پایہ ادیب اور کالم نگار جناب نعمان منظور کی تصنیف ''خطوط نم'' کے حوالہ سے اپنے محترم قارئین تک ان کے اسلوب اور ان کے احساسات کی ایک دلچسپ اور غمناک کہانی پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں مگر اس سے قبل نعمان منظور صاحب کے مطابق جناب خالد احمد کا مختصر تعارف نذر قارئین کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جناب خالد احمد 5 جون 1943 کے روز لکھنو میں محمد مصطفیٰ خان مداح کے گھر پیدا ہوئے' ان کی والدہ ماجدہ کا نام انور جہاں بیگم تھا' خالد احمد کا پورا گھرانہ ہی ماشاءاللہ علم وادب سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ ان کی بڑی بہنیں محترمہ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور پاکستان کی مشہور و معروف افسانہ نگار جبکہ ان کی چھوٹی بہن شاہدہ خیری، حبیب الوہاب الخیری کی اہلیہ ہیں۔ یہ بھی افسانہ نگار تھیں۔ طبیعات میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد خالد احمد نے ملازمت اختیار کر لیں۔ آپ ادبی مجالس کی جان تھے۔ تمام عمر ادب و صحافت میں گزار دی۔ خالد احمد، ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے بعد آنے والی نسل کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے تعارف کے لئے ان کا یہ شعر ہی کافی ہے کہ:

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں!
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

.....

نعمان منظور کا خالد احمد کے ساتھ باپ بیٹے، استاد شاگرد، بھائی اور ہمدم خاص جیسا تعلق تھا۔ ان کے جانے کا صدمہ نعمان منظور برداشت کر کے بھی یوں لگتا ہے جیسے برداشت نہ کر سکے ہوں۔ لکھتے ہیں خالد بھائی جان کل میں آپ کی قبر پر گیا تھا اور دیر تک آپ کی قبر پر بیٹھا، بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا اور آخر میں چند مصرعے پڑھ کر وہاں سے چلا آیا، لیں آپ بھی وہ مصرعے سن لیں

آج تیری قبر کے سرہانے
دو کتبے لگائے ہیں
ایک پہ اپنا نام لکھا ہے
اور ایک پر خالد احمد

نعمان منظور جنھیں خالد احمد پیار سے نومی

کہتے تھے آج کتنا بے بس ہے نومی جو ایک کتبے کی صورت خود کو بھی خالد احمد کے پاس چھوڑ آیا ہے گویا نومی کی روح، ذہن، فکر، سوچ اور احساسات کی خوشبوئیں خالد احمد کے مرقد ہی کے گرد طواف کر رہی ہیں۔ صرف اپنے جسم کا بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے نعمان منظور زیست کا باقی سفر کاٹ رہا ہے۔ نعمان منظور کی کیفیت وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو۔ 'کیا غضب کا لکھتے ہیں' خالد احمد بھائی جان! میں آپ کے رخصت ہونے کے بعد کانٹوں پر لوٹ رہا ہوں۔ کانٹے روح کے اندر تک اتر چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ ابھی شریان پھٹ جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ ایسا اس لئے نہیں ہو رہا کہ آپ بھائی جان عمران منظور کے ساتھ ملکر مجھے ''پتھر'' کا خطاب دے چکے ہیں۔ بس اب بھلا بتائیں کہ کبھی پتھر بھی روتے ہیں' مرتے ہیں' کبھی پتھر کو بھی درد ہوتا ہے۔ لیکن افسوس اب یہ پتھر بھی چور چور ہو چکا ہے' جاہد، نمر، حراء اور شبنم ابو ابو کرتے رہے۔ اپیا خالد، خالد کرتی رہ گئیں اور میں خالد بھائی خالد بھائی پکارتا رہ گیا۔ میرے انہی ہاتھوں میں آپ نے دو ہچکیاں لیں اور بس! یار خالد بھائی جان کوئی اتنی بھی جلدی کرتا ہے۔ نمر میرے سینے سے لگا رو رہا تھا اور جاہد ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہا تھا' ماموں سب کچھ ختم ہو گیا' میں انھیں تسلی دے رہا تھا مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس جاہد اور نمر کو اپنے سینے سے لگائے روتا رہا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ 'دل ایسے تھا گویا ابھی دھڑکنا چھوڑ دے گا' میں ساری عمر آپ کو تنگ کرتا رہا اور آپ میرے ناز اٹھاتے رہے لیکن کبھی مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا' اب میں اکیلا ہو گیا ہوں' کون میری سرپرستی کرے گا، بھائی جان! میں آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں، خالد بھائی جان! آپ کے جانے سے دو ماہ پہلے آپ نے ہی تو کہا تھا، نومی! میرے دوستوں کو میری بیماری کے متعلق کچھ نہ بتانا وہ پریشان ہوں گے، آپ کے جانے کے بعد ہم سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن ہم ایک دوسرے سے آنسو چھپانا چاہ رہے تھے۔ میں نے ہتھیلیوں سے آنسو صاف کیے اور سب کو تسلی دی، میں سوچتا تھا کہ میں بڑا کٹھور دل انسان ہوں اور مجھے کسی بھی بات پر رونا نہیں آتا لیکن جب سے آپ گئے ہیں اپنے بارے میں سارے اندازے مٹی کے ڈھیر ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کو قبر میں اتارنے کے ساتھ میں اپنا حوصلہ بھی آپ کے ساتھ دفن کر آیا ہوں۔ خالد بھائی جان میرا کیا بنے گا مجھے کب سکون ملے گا۔

قارئین کرام! نعمان منظور کا یہ نثری مرثیہ، سوز اور نوحہ اپنی مثال آپ بن کر دنیائے ادب کے افسردہ اور رنجیدہ لوگوں کو ہمیشہ

رلاتا رہے گا۔ ہم شکر گزار ہیں اپنے جگری دوست ممتاز شاعر و نقاد جناب ڈاکٹر نثار ترابی کے جنھوں نے نہ صرف ہمیں نومی جی سے متعارف کرایا ہے بلکہ ہم خود ان کے ''خطوط نم'' پڑھ کر نم دیدہ ہو گئے ہیں۔ خالد احمد کی جن حسین یادوں اور باتوں کے تسلسل اور حصار سے جناب نعمان منظور اب تک نہیں نکل پائے ان کی جانب سے خالد احمد کے لیے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ:

گو یاد ستاتی ہے تیری پھر بھی دعا ہے
دن ایسا نہ آئے کہ تیری یاد نہ آئے

.....

ہم بھی پچھلے دنوں اپنے آبائی شہر ڈیرہ اسماعیل خان گئے تھے۔ حافظ خیر محمد کے وسیع و عریض قبرستان میں اپنے بابا جناب کوکب سرحدی اپنی امی جی اور برادر بزرگ جناب فاروق جان بابر آزاد کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔ کچھ لمحے ان کے ساتھ گزارے، خان لالہ کی قبر پر ہم نعمان منظور کی طرح اپنے نام کا کتبہ تو آویزاں نہ کر سکے، ہاں ان سے یہ ضرور کہا کہ خان لالہ جی، آپ کے بغیر زندگی بے لذت ہو کر رہ گئی ہے۔ اب کسی محفل میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہیں چلا بھی جاؤں تو اپنے دائیں طرف کی کرسی خالی رکھتا ہوں، شاید آپ آ جائیں، ہمیں یقین سا ہو چکا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، ان سے کہا اپنے پہلو میں کچھ جگہ خالی رکھیے گا، آنا تو ہم نے بھی آپ ہی کے پاس ہے، وہاں دونوں بھائیوں کی خوب محفل سجے گی اور میں آقائے نامدار سرکار دوعالم سرور کائنات فخر موجودات سیدنا حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نعت پیش کروں گا، وہاں بھی اپنی اولاد عزیز و اقارب اور پوری امت مسلمہ کے لیے ہماری دعاؤں کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہم بھی ان سے طالب دعا ہی رہیں گے اور امید واثق ہے ہمارے بچے بھی ہمیں دعاؤں کے تحفے بھیجتے رہیں گے۔ ہم بیتے دنوں کے قصے کہانیاں یاد کر کے نئے جہاں کی رعنائیوں میں کھو جائیں گے، خان لالہ۔ کتنا مزہ آئے گا آپ کی رفاقت میں، خان لالہ میں نے ٹھیک کہا ناں، کہیے ناں، نیئر واہ کیا بات ہے، کیا خوبصورت کالم لکھا ہے، آنکھیں نم ہو گئی ہیں، چلو پھر کبھی سہی اب مزید باتیں نہیں کر سکوں گا، نومی جی کو میرا اسلام کہنا' کہنا کہ آپ کا خالد احمد اب بھی زندہ ہے، آپ جیسے مخلص اور باوفا دوستوں کے دلوں میں جیسا کہ میں زندہ ہوں اپنے برادر اصغر نیئر سرحدی، اپنے بچوں اور عزیز و اقارب کے دلوں میں، کیونکہ جو لوگ اچھی حسین یادیں چھوڑ جاتے ہیں وہ مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

گوہر نایاب

ادب کے قدر دان جب اپنے سامنے کوئی ادبی شاہکار دیکھتے ہیں تو قلبی راحت نصیب ہوتی ہے کیونکہ ادب ہمارا قیمتی سرمایہ اور علم و دانش کا ایک ایسا بے کراں سمندر ہے کہ جس میں غوطہ زن ہو کر چاہے جتنے بھی بیش بہا موتی سمیٹے جائیں تو کم ہیں۔

بلاشبہ جو لوگ ادب کی خدمت کرتے ہیں یا اپنی ثقافت و تہذیب اور اخلاقی اقدار کو قلم بند کرتے ہیں، وہ قابل ستائش و تحسین ہیں۔ آفتاب احمد ملک ادبی دنیا کا وہ جگمگا تا ستارہ ہیں جن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

اگرچہ آفتاب احمد ملک کی زیادہ تصانیف ادب و تاریخ کو رقم کرنے سے متعلق ہیں اور تاریخ لکھتے ہوئے عموماً دیگر ادبی نثر پاروں کی طرح ایک مؤرخ کے پاس اگر الفاظ کا اتنا متنوع سلسلہ یا احتراج نہ بھی ہو تو ادبی قوانین میں اس تصنیف یا کتاب پر کوئی قدغن نہیں کیونکہ اصل مدعا تو تاریخ، واقعات و حقائق کو ترتیب وار درج یا بیان کر دینا ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود آفتاب احمد خیر پوری کی تصانیف پڑھتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ گویا الفاظ ان کی قلم کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں اور ان کی تحریروں میں ایسی ہمہ گیریت دیکھنے کو ملی ہے جیسے بہت عمدگی اور نفاست سے نگینے جڑے ہوں۔

ان کی تصانیف میں حقائق کو اتنی خوبصورتی سے بیان کیا جاتا ہے کہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور تحریر کی یکسانیت ہماری توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے۔

''خیر پور تاریخ کے آئینے میں'' جب نظروں سے گزری تو بھرپور طمانیت کا احساس ہوا کہ نہ صرف اہل دیہہ اور علاقہ کو نہایت شائستگی اور خوبصورتی سے تاریخ کی سلسلہ وار کڑیوں سے روشناس کروایا ہے بلکہ ''خیر پور'' گاؤں اور دیگر ملحقہ علاقوں کی تاریخ کی بھی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔

تقریباً 200 صفحات پر مشتمل اس جامع کتاب کی جامعیت، زینت اور قدر و قیمت کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کی خوبصورتی و دلکشی میں الفاظ میں سمونا مشکل ہے اور میرے پاس گویا ذخیرہ الفاظ کم پڑ رہا ہے۔

یہ حقیقتاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ آفتاب احمد خیر پوری نے اس کتاب کو ترتیب دیتے ہوئے گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

انھوں نے اس کتاب میں ہر کتب فکر سے متعلق مکمل رہنمائی فراہم کی ہے۔ چاہے وہ اس علاقے کا جغرافیہ ہو یا مختلف نسلوں اور پشتوں کا تاریخی پس منظر اہل دیہہ کی دینی و دنیاوی خدمات کا تذکرہ ہو یا اہل علاقہ کے لیے درکار بنیادی سہولیات کا ذکر، قدرتی وسائل کی بات ہو چاہے سیاسی منظر نامہ، صحافتی ارتقائی سفر کی بات ہو چاہے گم گشتہ تہذیبوں کے تذکرے، مؤرخ نے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات اور چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے نکتے کو بہت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔

تصنیف میں تاریخ و ادب کو یکجا کر کے گویا اس کو چار چاند لگا دیے ہیں اور ایک ہی وقت میں قاری کو دو طرح کی خوبصورتی سے محظوظ کیا ہے۔

آخر میں اتنا کہوں گی کہ یہ کتاب ''خیر پور کی تاریخ کے آئینے میں'' بلاشبہ ایک انمول خزانہ ہے جو آنے والی ہر نسل کے لیے ایک گوہر نایاب ثابت ہوگی۔ اس عظیم ادبی و تاریخ خدمت کے لیے اہل علاقہ آفتاب احمد خیر پوری کے ممنون و مشکور ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو صحت و تندرستی بھری عمر دراز عطا فرمائے اور آپ ادب کی ہمیشہ یوں ہی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

سبینہ سلطانہ

ایزد عزیز: حیرت کا ہم راز

دھند کی سفید چادر نے سامنے کا منظر ڈھانپ رکھا تھا۔ ڈرائیور محتاط دکھائی دے رہا تھا اور گاڑی کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے موبائل پر وقت دیکھا اور گاڑی کی سست رفتاری پر کفِ افسوس ملنے لگا۔ پاک پتن سے ساہیوال کا سفر کسی ایک برِاعظم سے دوسرے برِاعظم کے سفر میں تبدیل ہو گیا۔ گاڑی کی حد درجہ سست رفتاری کے باوجود بھی میں مقررہ وقت سے پہلے ہی ڈی۔ پی۔ ایس پہنچ گیا۔

میرا وجود برف ہو رہا تھا۔ یخ بستگی نے رگ و پے کو جکڑ لیا تھا۔ کمرہ گرم تھا سو کچھ دیر بعد ہاتھ پاؤں سیدھے ہوئے تو دماغ بھی چلنے لگا۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ حسرت بلال موبائل میں منہمک تھا اور محترم واصف سجاد، سیّد غضنفر عباس (مرحوم) کا شعری مجموعہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے مراقبے سے سر اٹھایا، میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ واصف سجاد نے مسودہ لپیٹا اور ایزد عزیز کے ادبی سرمایے پر گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ جب ہم نے ایزد عزیز کے لواحقین کی موجودگی میں کمرہ کھولا تو وہاں سے تین کتابیں ملیں۔ جو یقیناً مرحوم کے زیرِ مطالعہ تھیں۔ ان میں یاسر بھائی آپ کا شعری مجموعہ ''جو گرہیں کھول دی جائیں'' بھی شامل تھا۔ میرے چہرے پر مسکان پھیل گئی اور اطمینان نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ مجھے (مرحوم) سے کی گئی ملاقات یاد آ گئی۔

اپریل دو ہزار انیس کا دن تھا۔ سورج دس بجے کے قریب ہی پوری آب و تاب سے آسمان پر روشن تھا لیکن دھوپ میں تمازت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں جناح لائبریری کے باہر سید تحسین گیلانی کا انتظار کرتے

یاسر رضا آصف

ہوئے رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور وہ موٹر سائیکل پر آ پہنچا۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا کہ بھائی جانا کدھر ہے؟ ''آج آپ کو ایک ادبی شخصیت سے ملوانا ہے۔'' تحسین گیلانی نے موٹر سائیکل دوڑاتے ہو بتایا۔ میری تحسین گیلانی سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ وہ انہاک کے تحت میرے شعری مجموعے کی تقریب کروانے والے تھے۔ بعد میں انھوں میری تنقیدی کتاب ''کاشف سجاد کی شاعری'' بھی اپنے اشاعتی ادارہ سے طبع کی۔ جس میں اتنا وقت لگا کہ مجھے قیامت کا دن یاد آنے لگا۔ خیر ہم تھوڑی دیر بعد ایک چائے والے ہوٹل پر پہنچ گئے۔

دراز قد شخص جس نے تازہ شیو بنایا ہوا تھا اور چہرے مہرے سے کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ ہمیں خوش آمدید کہا۔ ان کی شخصیت بارعب تھی اور جاذبیت لیے تھی۔ یہ میری محترم ایزد عزیز سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ مصافحہ کرتے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ہاتھ کی گرفت خاصی مضبوط ہے اور صحت بھی قابلِ رشک حد تک اچھی ہے۔ ہم دونوں ان کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل زیادہ کشادہ نہیں تھا اور دھویں کے باعث سیاہی نے دیواروں اور چھت پر طرح طرح کے نقش و نگار بنا رکھے تھے۔ وہ خود ایک خستہ سی چارپائی پر بیٹھ گئے اور ہمیں کرسیوں پر بیٹھ جانے دیا۔ انھوں نے ہمارے لیے کرسی چھوڑ دی حالاں کہ کئی لوگ تو کرسی کے لیے دنیا چھوڑنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

تحسین گیلانی نے ایزد عزیز کا تعارف کروایا۔ ان کی طبع شدہ کتابوں کے متعلق بتایا اور ادبی سفر پر روشنی ڈالی۔ اس تمام تعارف کے دوران ایزد عزیز سگریٹ پیتے رہے اور ہوں ہاں کرتے رہے۔ مجھے واضح دکھائی دے رہا تھا کہ انھیں اپنی تعریف سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ میں نے ایسے بہت سے ادیب دیکھے ہیں کہ آپ ان کا تعارف کرواتے ہوئے ذرا سا چوکے اور انھوں نے فوراً اصلاح فرما دی۔ پھر تعارف، جس کے پسِ پردہ تعریف ہی ہوتی ہے اس کے دوران گردن اکڑائے ایک شان سے مسکراتے رہتے ہیں۔ یہاں معاملہ خاصہ مختلف تھا۔ ایسی بے نیازی کسی صوفی کے ہاں ہو سکتی ہے یا پھر ایسے شخص کے ہاں جو ماضی سے بے نیاز ہو چکا ہو اور لمحہ موجود میں زندہ ہو۔ ایزد عزیز کا یہ رویہ مجھے متاثر کیے بنا نہ رہ سکا۔

میں نے جب مجید امجد کا نام سنا تو سوالات کی رگ پھڑک اٹھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں مجید امجد کے متعلق کتنے ہی سوال کر ڈالے۔ انھوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی، سگریٹ کا لمبا کش کھینچا اور ہاتھ کو لہراتے ہوئے یادوں کے کینوس پر تصویر کاری کرنے لگے۔ مجھے گفتگو سے ان کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ ہوا تو میں

نے کچھ سنانے کی فرمائش کر دی۔ وہ سنانے کے لیے سوچ ہی رہے تھے کہ لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ چائے اور سگریٹ کا رشتہ شاعری اور ادب سے کتنا گہرا ہے میں آج تک نہیں جان سکا مگر ان کا آپسی ملاپ خیال کو پرواز ضرور عطا کر جاتا ہے۔ انھوں نے کچھ اشعار اور ایک پنجابی نظم سنائی اور مسحور کر دیا۔ اشعار میں الفاظ کی نشست و برخاست اور نظم میں خیال آرائی کمال تھی۔

میں نے اپنا شعری مجموعہ ایزد عزیز کی خدمت میں پیش کیا اور تقریب میں آنے کی دعوت بھی دی۔ انھوں نے بھرپور مسکان سے میرا شکریہ ادا کیا اور آنے کا وعدہ کر لیا اور وہ آئے بھی۔ وہ فوراً ہی کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ میں چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے انھیں دیکھ رہا تھا۔ ان کا انہماک بتا رہا تھا کہ انھیں ادب سے محبت ہے۔ ہم ادیب لوگ اکثر یہ فقرہ استعمال میں لاتے ہیں کہ فلاں نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے لیکن ادب کے لیے اپنا آپ وقف کر دینے والے معدودے چند ہی دیکھے ہیں۔ ہم جیسے صرف ادب کی سیڑھی پر چڑھ کر نمایاں ہونے کے چکر میں ہوتے ہیں تاکہ لوگ ہمیں دیکھ سکیں۔ ایزد عزیز نے سر اٹھایا اور جملہ بولا جو میرے لیے سرمایے سے کم نہیں۔ ”نوجوان آپ ایک اچھے شاعر ہو۔“ یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور وہ سر بھی ہلا رہے تھے۔ جیسے

مجھے یقین دلا رہے ہوں کہ یہ سچ ہے۔

ہم نے اجازت چاہی۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ مجھ سے گلے ملتے ہوئے انھوں نے خدا حافظ کے الفاظ ادا کیے۔ واپسی پر میں نے تحسین گیلانی سے ایزد عزیز کی رہائش گاہ کے متعلق پوچھا اور چند نجی زندگی کے بارے بھی سوالات کیے۔ جوابات کے ذریعے مجھ پر ”کلے رکھ داوین“ کی وجہ تسمیہ کھلی اور میں چپ ہو گیا۔ ایک اور بات جس نے مجھے حیران کیا کہ ایزد عزیز نے پوری گفتگو کے دوران کہیں بھی کسی شاعر کی ہتک نہیں کی تھی۔ شاعر ہو اور کسی ہم عصر سے تسل بازی نہ ہو، غیبت نہ کرے، ایسا ہونا ناممکن سا لگتا ہے لیکن ایسا ہوا تھا۔ تحسین گیلانی نے مجھے ڈی پی ایس چھوڑا اور میں ایزد عزیز کی مسحور کن شخصیت کے بارے سوچتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

محترم واصف سجاد شاید مجھ سے کچھ پوچھ کر جواب کے منتظر تھے اور میرے چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ میں جسمانی طور پر ان کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر ذہنی طور پر ایزد عزیز کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ مجید امجد کے کلام کی تدوین کے حوالہ سے مطمئن نہیں تھے۔

مجھے دور سے واصف سجاد کی آواز سنائی دی۔ پھر ان کا مدھم چہرہ واضح ہونے لگا۔ آخر کار میں واپس آ ہی گیا۔ وہ مجھے آرٹس کونسل میں سترہ تاریخ کو ہونے والی تقریب کے متعلق بتا رہے تھے اور میں ایزد عزیز کو ڈھونڈنے کے

مرغولے بناتے دیکھ رہا تھا۔ ذہن ایک مرتبہ پھر ماضی کی ایک اور یاد کو میرے سامنے تصویر کرنے لگا۔

ساہیوال آرٹس کونسل میں مشاعرہ تھا اور میں کالج سے سیدھا آرٹس کونسل پہنچ گیا تھا۔ اسٹیج پر معزز شخصیات موجود تھیں۔ پروگرام پوری آب و تاب سے جاری تھا۔ میں ایک خالی نشست دیکھ کر بیٹھ گیا۔ میرے بائیں جانب محترم ایزد عزیز بیٹھے تھے۔ میں نے انھیں سلام کیا اور انھوں نے مجھے جھٹ سے پہچان لیا۔ حال احوال دریافت کرنے لگے۔ تقریب کے دوران وقفے وقفے سے ہماری بات چیت جاری رہی۔ اختتام کے بعد وہ کافی دیر مجھ سے باہر کھڑے بات چیت کرتے رہے۔ اب کی بار بھی ساری باتیں علمی و ادبی نوعیت کی تھیں۔ کہیں کوئی شکوہ کوئی شکایت شامل نہیں تھی۔

میں نے ایک شاعر کے رویے کے متعلق شکوہ کیا تو مجھے سمجھانے کے انداز میں بڑوں سا کردار نبھاتے ہوئے بولے "اگر تو آپ نے یہ بات کسی سے سنی ہے تو سنی سنائی بات پر کان نہیں دھرتے اور اگر آپ نے اس کے منہ سے سنی ہے تو درگزر کر دیں۔" میں نے کہا کہ مجھ تک یہ بات کسی کے ذریعے پہنچی ہے۔ انھوں نے فوراً کہا "پھر تو بھول جاؤ اور راستے سے مت بھٹکو۔" وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ان کی وہ بات آج تک نہیں بھولا بلکہ اکثر میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور میں اب ہر چبھتی بات درگزر کر دیتا ہوں۔

ان سے مزید بھی ملنا ملانا ہوتا مگر کرونا کی وبا نے سبھی لوگوں کو احتیاط کے دائروں میں قید کر دیا۔ میں بھی اپنے شہر تک محدود ہو گیا۔ میں نے خود کو موبائل، کتاب اور اپنی ذات میں گم کر لیا۔ وبا کی شدت میں کمی ہوئی تو ساہیوال پھر سے آنے جانے لگا۔ نعمان راؤ سے ملاقات ہوئی اور ایزد عزیز کا ذکر بھی ہوا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر اچانک ان کی وفات کی اندوہناک خبر ملی۔ دل بیٹھ گیا۔ مجھے ان کا بیٹھنے کا انداز، گفتگو کا جادو اور لہک لہک کر شعر پڑھنا سب کچھ یاد آنے لگا۔

سوچتا ہوں کہ اب ان سے ملاقات "عالم ارواح کے مال روڈ پر" ہی ہو سکتی ہے۔ میرے ذہن کے تہہ خانے میں ایک سوال ان سے پہلی ملاقات کے سمے سے کلبلا رہا ہے۔ اب میں کب تک جگنو کو تہہ خانے کے اندھیرے میں قید رکھ سکوں گا۔ ان کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پوچھوں گا ضرور، "عشق اور تنہائی کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ جس دل میں بھی عشق نے ڈیرہ ڈالا اسے تنہا کر کے رکھ دیا۔" اب میں اس تجسس کا شکار ہوں کہ وہ اس کا جواب کیا دیں گے۔ چوں کہ ان کی پوری زندگی جواب ہی جواب تھی۔ ہم خیال کے در پر دستِ سوال دراز کرنے والے لوگ کیا جانیں کہ ادب سے عشق کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اپنے عہد کے ماہرِ عروض اور پختہ گو شاعر پروفیسر خالد بزمی

نعت گوئی کا آغاز رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں حضرت حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن زبیر اور عبداللہ بن رواحہؓ سے ہُوا، جنھوں نے عربی نعت میں اپنی والہانہ عقیدت اور عظمتِ رسولؐ کو بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ بیان کیا بعد میں سعدیؒ و جامیؒ اور رومیؒ جیسے شعرا نے فارسی زبان میں مدحت سرائی کے گلزار کھلائے، اُردو ادب میں علامہ اقبالؒ اور محسن کارکوروی سمیت کئی شعرا نے اُردو نعت میں جو گل ہائے سخن کھلائے اُن کی مہک کو آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر خالد بزمی کا شمار بھی ایسے ہی خوش نصیب نعت گو شعرا میں ہوتا ہے، جو حقیقی طور پر عاشقِ رسولؐ تھے ان کی نعتیں عشق و مستی سے لبریز ہیں۔ عشقِ محمدؐ جیسی کیفیت سے سرشار ہونے پر ان کے ہاں بہت سے حمد ونعت، مناقب اور سلام کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں جن کی خوشبو ایک عالم کو تادیر مہکائے رکھے گی۔ بہت سے شعرا کو انہی کی نعت سے نعت گوئی کی ترغیب حاصل ہوئی، ان کا کلام جذبات کی دلکش بنیادوں پر استوار ہے۔

یہ سب اللہ کا کرم اور لطف ہے بزمی
ورنہ کب مجھے نعت پیغمبر کا سلیقہ ہے

پروفیسر خالد بزمی ایک قادر الکلام شاعر، ادیب، محقق، نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وسیع المطالعہ انسان تھے، وہ اپنے عہد کے پختہ گو شاعر اور علمِ عروض کے ماہر ہونے کے ساتھ ایک کامیاب معلم بھی تھے۔ انھوں نے اپنے علمی چراغ سے ہزاروں طالبانِ علم وادب کی سوچوں کو منور کیا، انھوں نے ابتدائی تعلیم امرتسر بھارت سے حاصل کی بعد میں تقسیم ہند کے وقت پاکستان کے شہر لاہور میں سکونت اختیار کرنے پر اسلامیہ ہائی سکول لوئر مال سے ٹاپ پوزیشن کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے پہلے ایف اے اور پھر بی اے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی، دورانِ تعلیم اسی ادارے میں

صدام ساگر

لیکچرار مقرر ہوئے، کچھ عرصے کے بعد پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر بنے تو انجمن حمایت اسلام کی پاداش میں انھیں لاہور سے ملتان ٹرانسفر کر دیا یہ ایک مشکل وقت تھا جب اپنا گھر بار چھوڑ کر جانا پڑا۔ اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے عربی اور ۱۹۵۸ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم اے علوم اسلامیہ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۶ء میں ایم اُردو کیا، اس طرح ایم اے کے تین امتحان پاس کئے اور یونیورسٹی انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ سکالرشپ پر سعودی عرب گئے اور وہاں یونیورسٹیوں میں لیکچرز دینے لگے، سعودیہ قیام کے دوران انھوں نے دو نعتیہ شعری مجموعے ''منہری جالیوں کے سامنے اور ''سبز گنبد دیکھ کر'' لکھے، پہلا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہُوا اور دوسرا مجموعہ ان کی رحلت کے بعد ان کی صاحبزادی عافیہ بزمی نے فیروز سنز سے شائع کروایا۔ ان نعتیہ شعری مجموعوں میں شامل کلام میں وہ نہ صرف اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کھل کرتے ہیں بلکہ ان میں والہانہ پن انتہا درجے کا نظر آتا ہے۔ ان کی فکر و خیال کی روشنی سے نعت کا ایک ایک شعر جگمگاتا ہُوا ہمارے دلوں کو منور کرتا ہے۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جدھر دیکھو، اُدھر بیچارگی تھی آپؐ سے پہلے
بہت مجبور ہر سو زندگی تھی آپؐ سے پہلے

بظاہر پھول کھلتے تھے، مگر خوشبو سے عاری تھے
گلستاں میں کہاں یہ تازگی تھی آپؐ سے پہلے

.....

بزمی صاحب کا یہ نعتیہ کلام ۱۹۸۱ء میں شیخ صفدر علی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلّہ ''شام و سحر'' کے نعت نمبر میں پڑھنے کو ملا۔ اسی نعت کے ایک شعر میں وہ حضرت دحیہ کلبیؓ کے زمانہ جاہلیت اور بیٹیوں کے زندہ دفن کرنے کا واقعہ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

حقیقی بیٹیوں کو باپ زندہ گاڑ دیتے تھے
یہ غیرت بھی عجب بیہودگی تھی آپؐ سے پہلے

.....

پروفیسر خالد بزمی کی تصانیف پر نظر ڈالیں تو اُن میں ''مجھے ہے حکمِ اذاں (دینی قومی اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ)، ''سید سادات (نعتیہ مجموعہ)''، ''علامہ ابن جریر (ایم اے کے دوران لکھے جانے والے مقالے کی کتابی صورت)''، ''آئینہ خیال (غزلیہ مجموعہ)''، ''آغوشِ صدف (غزلیہ مجموعہ)''، ''گوہر نایاب (غزلیہ مجموعہ)''، ''تمدن تاریخ و اسلام (تین جلدوں میں لکھی جانے والی اسلام کی تاریخ)''، ''اسلامی تعلیمات (عرصہ دراز تک نصاب کا حصہ رہنے والی کتاب)''، ''نسیم حجاز''، ''افہام القرآن''، ''طفلستان'' و دیگر کتب نمایاں ہیں۔ ان کی لکھی اسلامی کتابیں سالہا سال پنجاب کے تعلیمی اداروں میں

پڑھائی جاتی رہیں۔ بزمی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے افسوس زندگی نے وفا نہ کی اور اس سعادت سے محروم رہے۔ جبکہ سالہا سال ان کی قرآن و حدیث کی تعارف والی کتابیں اور تاریخ اسلام تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

ان کی پہلی نظم ''مسلم سے خطاب'' لکھی جوان کے شعری مجموعے ''مجھے ہے حکم اذاں'' میں بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ بزمی صاحب نے غزل کے پاکیزہ ذوق کے ساتھ بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھی، بچوں کے ادب میں ان کی مقبول ہونے والی کتب میں ''سنو پیارے بچو'' اور ''بچپن کے نغمے'' شامل ہیں۔ ادب کے ہر میدان میں کامیابیاں سمیٹنے والے پروفیسر خالد بزمی نے نعت گوئی میں شہرت کی بلندیوں کو چھوا اور نعت گو شعرا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ وہ شعر کی ہر صنف میں نئی نئی زمینیں نکالنے پر مہارت رکھتے تھے، کئی نامور ادبی چہرے ان کے حلقہء یاراں میں رہے۔ جن میں عاصی کرنالی، منیر فاطمی، حفیظ الرحمٰن احسن، حفیظ تائب، خالد شفیق، علیم ناصری، عابد نظامی، محمد شریف بقا، صوفی افضل فقیر، بشیر چٹھہ، منظور علی شیخ، ارشد بھٹی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر آفتاب نقوی، ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ اور بہت سے قریبی دوست تھے۔ ہمدرد ٹرسٹ کے بانی حکیم محمد سعید سے بھی ان کا بہت قریبی تعلق رہا۔ اس کے علاوہ ان کی مولانا مودودی اور احسان الٰہی ظہیر سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

شاگردوں میں جماعت اسلامی کے نائب امیر حافظ ادریس، شعیب بن عزیز، اظہر سہیل، امجد اسلام امجد، تحسین فراقی، مرغوب حسین طاہر، تجمل فاروق بانی، میاں عثمان جیسے لوگ شامل تھے۔

پروفیسر خالد بزمی شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ، ظفر علی خانؒ اور حالیؒ کو نہ صرف پسند کرتے بلکہ ان کا کلام بھی ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے تھے۔ میر اور غالب بھی ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کے ''کریسنٹ'' میگزین کے ایڈیٹر رہے اور کئی سال تک شاندار طریقے سے قلمی خدمات سرانجام دیتے ہوئے انھوں نے حالی، شبلی اور اقبال جیسے یادگار نمبر شائع کیے۔ اس رسالے میں ان کے معاونین میں اظہر سہیل، ارشد محمود، نعیم اختر اور شعیب بن عزیز شامل تھے۔

''کریسنٹ'' کے علاوہ بھی وہ مختلف رسالوں اور جرائد کے ایڈیٹر رہے۔ خالد بزمی کو نثر اور شاعری دونوں پر کمال حاصل تھا، انھوں نے غزل، نظم، حمد و نعت میں نایاب کلام تخلیق کیا۔ وہ اپنے حمدیہ، نعتیہ اور غزلیہ کلام کی بدولت ادبی حلقوں میں منفرد اور اعلیٰ پہچان رکھتے تھے۔ بچوں کے مقبول رسالے ''تعلیم و تربیت'' کے مدیر بھی رہے اس رسالے میں کئی برس بیت جانے کے بعد بھی ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے۔ بچوں کی نظموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے عرب کی

کہانیاں کے نام سے عرب کی لوک کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا جو کتابی صورت میں نہ صرف منظرِ عام پر آیا بلکہ ''تعلیم و تربیت'' میں اس کی اشاعت کا سلسلہ قسط وار جاری رہا۔

پروفیسر خالد بزمی منفرد اسلوب اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، اردو ادب میں انھیں بہ حیثیت شاعر قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے کلام کو محبت، عقیدت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کلام میں فکری وفنی اور اسلوبیاتی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ کئی غزل گو شعرا کو نعت لکھنے پر مائل کیا، نعتیہ ماہانہ مشاعروں کی بنیاد تاج کمپنی میں نعتیہ مشاعرے کروا کر اُس وقت رکھی گئی جب نعت کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں تھا۔ نعت گو شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا خالد بزمی جیسے ہنر مند اور باکمال شخص کا ہی کمال تھا، اس حوالے سے ان کا نام ہمیشہ تاریخِ ادب کے اوراق میں سنہری حروف میں لکھا جاتا رہے گا۔

پروفیسر خالد بزمی کی چند کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا لیکن گزشتہ روز ان کی صاحبزادی عافیہ بزمی نے ان کی وفات کے بعد چھپنے والے حمدیہ، نعتیہ شعری مجموعے ''جبینِ نیاز'' کا تحفہ بھیجا۔ جسے پڑھ کر بے حد مسرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ افسوس اس بات پر ہُوا کہ بہت سے شاعروں کے کوچ کر جانے کے بعد اُن کی اولادیں اُن کا سرمایہ کتب فروخت کر دیتے ہیں۔ مگر عافیہ بزمی نیک سیرت باپ کی بیٹی ہونے کا فرض ادا کر رہی ہے۔ عافیہ بزمی خود بھی نثر کے ساتھ ساتھ ہلکا پلکا شاعری کا تڑکا لگاتی رہتی ہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کی طرح تین ایم اے نہیں بلکہ دو ایم اے پاس کرنے کا ریکارڈ بنا رکھا ہے۔ ان کی ایک بہن بھی بہت عمدہ لکھاری تھیں جس کی وفات ہو چکی ہے جبکہ ایک بھائی نے موجودہ حالات کے پیشِ نظر لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بھارت کے شہر امرتسر میں شیخ عبدالعزیز امرتسری کے ہاں پیدا ہونے والے محمد یونس جو شعر و سخن کی دنیا میں خالد بزمی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت کچھ لکھنا ابھی باقی ہے۔ ان کا تخلیق کردہ کام موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے بیش بہا خزینہ ہے جو صدیوں تک قارئینِ اردو ادب کے کام آتا رہے گا۔ سب کے چاہنے والے پروفیسر خالد بزمی کی وفات ۱۳ جولائی ۱۹۹۹ء کو ہوئی جو آج بھی لاہور کے میانی قبرستان میں دفن ہیں۔ آخر میں ''جبینِ ناز'' سے حمدیہ اشعار:

کتنے ناداں ہیں خدا کو آج تک سمجھے نہیں
کیسے کیسے لوگ بزمی سے خطا کاروں میں ہیں

.....

کچھ بھی ہو بزمی کے دل کو یہ تو اطمینان ہے
دونوں جہاں کا پروردگار تیرے سوا کوئی نہیں

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر اشفاق ورک ___ مجال

کہیں ریشم، کہیں اطلس کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تیری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ نفاست ، یہ ادا
جی میں آتا ہے تیرا نام میں اُردو رکھ دوں

.....

اردو ادب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھی جائے تو صنفِ شاعری سفر کرتی دکھائی دیتی ہے ایک عرصہ تک شاعروں کی کثیر تعداد ہجر و وصال، عشق و محبت، وفا و جفا، حسن و جمال جبکہ باقی قلیل تعداد سماجی استحصال، ظلم و جبر کے خلاف شاعری کرتی نظر آتی ہے ایسی صورتحال میں تضحیک اور مزاح کے مابین فرق کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے خالص اور سچی قلبی واردات کو مزاح کا رنگ دیکر شعری پیرائے میں بات کرنا ایک ناممکن نہ سہی مشکل کام ضرور ہے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک صاحب بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں جس کا رنگ ان کی خاکہ نگاری، شاعری اور کالم نگاری میں بدرجہ اتم موجود ہے ان کا نیا شعری مجموعہ ''مجال'' حمد و نعت، نظم و غزل، بریفانہ/ تحریفانہ، ظریفانہ، طالب علمانہ اور بچگانہ پر مشتمل ہے ان کی شاعری میں سلاست، شعریت، مقصدیت و معنویت مکمل طور پر موجود ہے
حمد میں بھی وہ خدا تعالیٰ سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار بڑی خوبصورتی کرتے ہیں حمدِ باری تعالیٰ کے دو اشعار دیکھئے:

زمیں کی قید سے تُو اس طرح رہائی دے
جو آسماں سے پرے ہے، وہ سب دکھائی دے

سُنا ہے میں ہی جہاں بھر میں تیرا نائب ہوں
اگر ہے یوں تو مجھے کُن تلک رسائی دے

.....

خدا سے ہلکا پُھلکا شکوہ، اجازت، مکاں اور لا مکاں کے بھید جاننے کی تشنگی ہی ایسے اشعار کہنے پر مائل کر سکتی ہے۔
ڈاکٹر صاحب کے شعری مجموعے کی خاص بات انسانی رویوں، کیفیات اور جذبات و احساسات کا خوبصورت اظہار یہ ہے ان کی غزل کے دو اشعار دیکھئے:

طلحہ غفور

لفظ بُننے کا فن نہیں آتا
ہم کو سُننے کا فن نہیں آتا

باغ در باغ سب نے لُوٹا ہے
پھول چُننے کا فن نہیں آتا

.....

ان اشعار میں انسانی رویوں کو جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے یہی اس دور کی شاعری ہے جو میسج، میسجز اور فون کال کے رونے دھونے سے ماورا ہے انسان اور بالخصوص شاعر کے بنیادی اوصاف میں سے احساس پہلے نمبر پر ہے ڈاکٹر اشفاق صاحب کی شاعری پڑھتے ہوئے ان کی حساسیت کے ساتھ ساتھ ان کا مشاہدہ مطالعہ روز روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے غزل کی نسبت نظم کہنا قدرے مشکل امر ہے نظم کہنے کے لیے پوری نظم کا ایک مخصوص موضوع ہونا پھر اس کی بنت اور کرافٹ کا ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے سلیقہ مندی سے کام لینا پڑتا ہے تاہم ان کی اکثر نظمیں شروع سے ہی قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں ان کی ایک مختصر نظم ناسٹلجیا دیکھیے:

یادوں کی دہلیز پہ بیٹھا
جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں
دل کی تختی پوچ رہا ہوں

.....

ماضی کی باتوں کو یاد کرنا، ماضی میں زندہ رہنا، ماضی کو حال سے بہتر سمجھنا "ناسٹلجیا" کہلاتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں اس قسم کی صورتحال زیادہ نظر آتی ہے۔ پچھلی باتوں، گزرے دور کو شعور کا حصہ بنانے اور بکھرتے سانچوں کو منظم کرنے کی حسرت تعمیر "ناسٹلجیا" ہے ہمارے موجودہ معاشرے کی صورتحال کو دیکھا جائے تو آج کوئی بھی ایسا فرد نظر نہیں آئے گا جو ہمارے موجودہ حال کو ماضی سے بہتر قرار دے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کے شعری مجموعے مجال پر مبارکباد پیش کرتا ہوں بطورِ طالب علم مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے خیالات و محسوسات کو قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں اور ان کا یہ شعری مجموعہ ایک میٹھی اور منفرد خوشبو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جس سے قاری تادیر محسور ہوتا رہے گا۔

آخر میں ان کی ایک نظم "وسوسہ" دیکھیے:

ریت کے گھروندے نے
رات بھر ڈرایا ہے
جب بھی سونے لگتا تھا
نرم روخیالوں میں
گرم گرم جذبوں میں
جب بھی کھونے لگتا تھا
روک کر خیالوں کو
ٹوک کر جھمیلوں کو
کان میں وہ کہتا تھا
اس ذرا سی مہلت میں
کس سے ملنے آیا ہے؟
کیا کیا ڈھونگ رچایا ہے؟؟

☆☆☆☆☆

دل بہ دل

جلیل عالی

ہٹاؤ
یہ رخ سے دفاعی مکھوٹا
انا بازیوں کا
عبث ڈانگ سوٹا
ہیں بیکار
جعلی تاثر کی گھاتیں
حصارِ تحفظ سے باہر نکل کر
کرو بے خطر
اپنے شفاف اندر کی
معصوم باتیں
یہ دعوا کہاں ہے
کہ عاصی نہیں ہوں
مگر یہ یقینو
کہ دوئی سے ہوں دُور
میں ٹوہ میں محو
جاسوس دنیا کا باسی نہیں ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

جنگل میں قانون

جنگل میں قانون چلے گا آدم خوروں کا
جانے کب طوفان ٹلے گا آدم خوروں کا

آنکھوں کی بندش سے خطرے ختم نہیں ہوتے
خوش بختی ہے بخت ڈھلے گا آدم خوروں کا

جسم نہ جب انکار کریں گے لقمہ بننے سے
ان کے گوشت پہ غول پلے گا آدم خوروں کا

مجبوروں لاچاروں ناداروں کے سینے پر
روز قبیلہ مونگ دلے گا آدم خوروں کا

بھول ذرا ہو کمزوروں سے پکڑے جاتے ہیں
کب منصف کو ظلم کھلے گا آدم خوروں کا

جانے وہ دن کب آئے گا جس دن ہاتھ کوئی
دیواروں پر خون ملے گا آدم خوروں کا

آگ وہی بھڑکائی جائے جس کے شعلوں سے
ایندھن بن کر جسم جلے گا آدم خوروں کا

غزہ کے بیٹے اسرائیلی ٹینکوں کی زد میں
کیا یونہی اقدام پھلے گا آدم خوروں کا

کیا نہیں ایسی صورت کوئی اُجڑی دنیا میں
جب آہن ہر بار گلے گا آدم خوروں کا

گلزار بخاری

تثلیث

(۱)

کوئی مقصود ہی تو تھا ورنہ
آخری موڑ سے ذرا پہلے
راستے اور بھی نِکلتے تھے

(۲)

کس نے دیکھا ہَوا کا برتاؤ
ہاں مگر جب درخت پر پتّے
ہاتھ مَلتے تھے خاک ہوتے ہُوئے

(۳)

اِک ستارہ تھا ماہتاب کے ساتھ
ایک چہرا تھا آئنے میں مِرے
رات اُس کی گلی سے جب گزرے

(۴)

ہم گزر آئے ہیں کبھی کے مگر
راستوں میں ابھی تلک باقی
روشنی ہے ہمارے قدموں کی

خاور اعجاز

دِل کسی یاد کی خوشبو سے بہل جاتا ہے

اُس نے اک روز یہ پوچھا اُس سے
بن مرے کیسے گزرتے ہیں شب و روز ترے
کون آتا ہے تری راتوں کو روشن کرنے
کس کے گیسو یہ ترے شانوں پہ لہراتے ہیں

اُس نے..... اُس شوخ کے ہونٹوں پہ تبسم دیکھا
اُس کی آنکھوں میں تھا بیتا ہوا موسم..... دیکھا
اور کہا
نارسائی ہی جو دستورِ زمانہ ٹھہری
نارسائی پہ کسی شخص کے ماتم کیسا
(اور ماتم بھی کریں گے تو نہیں کچھ حاصل)
صحنِ گلشن سے گزرتے ہوئے شبنم جیسے
چھوڑ جاتی ہے رگِ گل پہ نشاں بوسوں کے
فطرتِ صبح میں ہیں..... گلشن و صحرا یکساں
اپنے ہی ڈھنگ سے..... ہر شے رقصاں
اور بن آہ بھرے..... اِتنا کہا
جب کوئی ساتھ میسر نہیں ہوتا اُس پل
دِل تری یاد کی خوشبو سے مہک جاتا ہے
پھول..... کوئی مری دہلیز پہ رکھ جاتا ہے

اسلام عظمی

نظم

صفدر صدیق رضی

وہ نظم جو مجھ سے کھو گئی ہو
نہ جانے کس ہاتھ لگ گئی ہو
وہ جس میں تیرا حسیں سراپا
اسی طرح میں نے لکھ دیا ہے
کہ جیسی تو ہے
ہر ایک مصرعے میں ہو بہو ہے
تری نظر تیری مسکراہٹ
تری صدائے خرام، تیری خموش آہٹ
مرے شب و روز
جس پر اگندہ حسن کی نذر ہو گئے ہیں
کئی مہ و سال کھو گئے ہیں
جو مجھ پہ گذری گذر گئی ہے
نہ جانے
کیا اس کے روز و شب پر گذر رہی ہو
وہ نظم جس ہاتھ لگ گئی ہو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جی سے چاہا تھا اگر مر نہ سکوں، زندہ رہوں
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اُترنے نہ دیا

مِرا غزہ کھنڈر آثار کر دیا گیا ہے

مِرا غزہ کھنڈر آثار کر دیا گیا ہے
تمام شہر کو مِسمار کر دیا گیا ہے

جہاں غزہ تھا ، وہاں اجتماعی قبر ہے اب
بِنَۂِ زمیں ، گُل و گلزار کر دیا گیا ہے

ہدف ہیں عورتیں ، بچے یا حاملہ مائیں
غزہ کا مرد عزادار کر دیا گیا ہے

سجا کے کربلِ ثانی ، حسینؓ زادوں پہ
غزہ ، یزید کا دربار کر دیا گیا ہے

دُھواں ، جو اُٹھتا ہے وہ دُور ہسپتالوں سے
خموش آخری غم خوار کر دیا گیا ہے

ہے جنگ بندی کا مقصود ، تازہ دم ہوتا
بچے ہوؤں کو خبردار کر دیا گیا ہے

طبل سرا ، سرِ میداں ہے آج عالمی جنگ
اب اور جینے کو دُشوار کر دیا گیا ہے

انیسِ جاں ! میں کدھر جاؤں ، کس طرف دیکھوں؟
کہ میرا راستہ ، دیوار کر دیا گیا ہے

محمد انیس انصاری

حفاظت میں گنوائے خواب

طالب انصاری

مرے خواب
خوش رنگ تعبیر کی آس میں
زندگی کے کواڑوں سے لگ کر کھڑے تھے

پھر آنکھوں کے چھجّوں پہ مایوسیوں کی
لگاتار بوندیں پڑی تھیں
یہ گیلے ہوئے تو
انہیں میں نے قسمت کی منڈیر پر سوکھنے کے
لیے رکھ دیا تھا
دلاسے کی دھوپ اتنی کافی نہیں تھی
انہیں سوکھتے سوکھتے شام ہونے لگی
پھر انہیں سینت کر
رات کی چارپائی پہ پھیلا دیا
گہری نیندوں کا پنکھا چلایا
یہ برگِ بریدہ کی صورت
نہ جانے کہاں جا گرے
اب انہیں بے بسی کی گلی میں
ادھر سے ادھر ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں
مرے دل کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی

دلداری

دیکھ سکھی!
میں جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی ہوں
پکی عمر کے بیچ گڑی ہوں
دیکھنے میں خود سے بھی بڑی ہوں
لیکن اب بھی
جب میں اپنی ماں کے پہلو میں جا بیٹھوں
تو تتلا بولنے لگ جاتی ہوں
ایڑیاں رگڑ کے پھر روتی ہوں
یوں لگتا ہے
ابھی تو جھولنے میں ڈالا ہے ماں نے مجھ کو
ابھی مجھے چلنا نہیں آیا
ابھی وہ اپنے ہاتھ سے میٹھے چندنوالے اور کھلائے
ابھی وہ بانہوں میں نرمی سے مجھے سلائے
یوں لگتا ہے
جب میں اپنی ماں کے پہلو میں جا بیٹھوں
ضدی اور نادان سی لڑکی پھر سے جاگنے
لگ جاتی ہے
دیکھ سکھی!
میں جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی ہوں
گزرے وقت کی ایک گھڑی ہوں
دیکھنے میں خود سے بھی بڑی ہوں
اتنی عمر گزار چکی ہوں
وقت کو جیت کے ہار چکی ہوں
لیکن اب تک
سہے کے ہر پل، ہر ساعت میں ماں
میرے ہونٹوں پر رہتی ہے
یوں تو اب میں خود بھی ماں ہوں.....
ماں مرے دل میں رہتی ہے
یوں لگتا ہے آج بھی ماں کی آنول بدن
کے ساتھ جڑی ہے
سانسیں اب تک بھی اس ڈور سے بندھی
ہوئی ہیں
دیکھ سکھی!
میں جہاں کھڑی تھی، وہاں کھڑی ہوں

رخشندہ نوید

ان باتوں پر خود سے کتنی بار لڑی ہوں

کبھی کبھی جب بیٹھے بیٹھے

دھیان میں ایسا وہم سمائے

خاک مرے منہ میں

مری ماں کو کچھ ہو جائے

پھوٹ پھوٹ کر بند کمرے میں

تکیوں کے اندر چھپ چھپ کر

روتے روتے بس یہی سوچوں

چپ مجھے آ کر کون کرائے

ایک وہی، جو صدقے واری ہو جاتی ہے

عشق کی ایسی حد دلداری ہو جاتی ہے

دیکھ سکھی!

اب تک کی دعائیں مرے لیے مری ماں نے مانگیں

مری تو بس اک یہی دعا ہے

مالک میرا ماں سے پہلے اس دنیا سے مجھے اٹھائے!

آنکھ مجھے وہ دن نہ دکھائے.....

جب مری ماں کو کچھ ہو جائے

☆☆☆☆☆

ماں اور اُستاد

.....ماں اور استاد
جنم تو دونوں دیتے ہیں
ایک کا ذمہ جسمانی
دوسرا رشتہ
روحانی

ماں دیتی روٹی کی صورت
فل انرجی ننھے کو
ٹیچر بخشے علم کی صورت
ذہن غذائیں بچے کو
دونوں مالی سینچتے جائیں
اک پودے کو شجر بنائیں
جھومتے جائیں
فخر کریں آغوش پہ اپنی
راہ زیست میں چھاؤں پہ اپنی
وہ نسلیں جو ماں سے سیکھیں
اور اپنے استاد سے سیکھیں
ان کا پہلا فرض ادب ہے
ماں کا اور استاد کا حق ہے
ان سے جو بھی پوچھنا چاہو
دل کی باتیں کرنا چاہو
حدِ ادب میں سب کچھ کہہ دو
ان سے ان کا علم سمیٹو
ہنر سمیٹو، پیار سمیٹو
جتنا بھی ممکن ہو تم سے
اُن سے اُن کی دعا سمیٹو
راہیں اپنی سبزہ کرلو

فرخندہ شمیم

سلسلۂ عشق

ہوتا نہیں ہے سینے میں ہر آدمی کا عشق
جاں سے جو ہو عزیز، ہو دل میں اُسی کا عشق

حسنِ صبیح ہو، کہ وہ حسنِ ملیح ہو
جچتا نہیں نگاہ میں اب تو کسی کا عشق

اس عشقِ نامراد کی معجز نمائیاں
مجنوں بنائے قیس کو اِک سانوری کا عشق

وہ والدین ہوں کہ ہوں احباب و اقربا
ہے عرصۂ حیات میں لازم، اُنھی کا عشق

کامل ولی کا عشق بھی اپنی جگہ ہے خوب
لیکن، حیات بخش ہے، ''سچے ولی'' کا عشق

یہ ''عشق سلسلہ'' بھی ہے کتنے کمال کا
''مولا علیؑ'' کے عشق سے پائیں، نبیؐ کا عشق

مقصودِ کائنات ہے، عشقِ خدائے پاک
یعنی، نبیؐ کا عشق ہے ''حسنِ جلی'' کا عشق

شوکت محمود شوکت

نظم

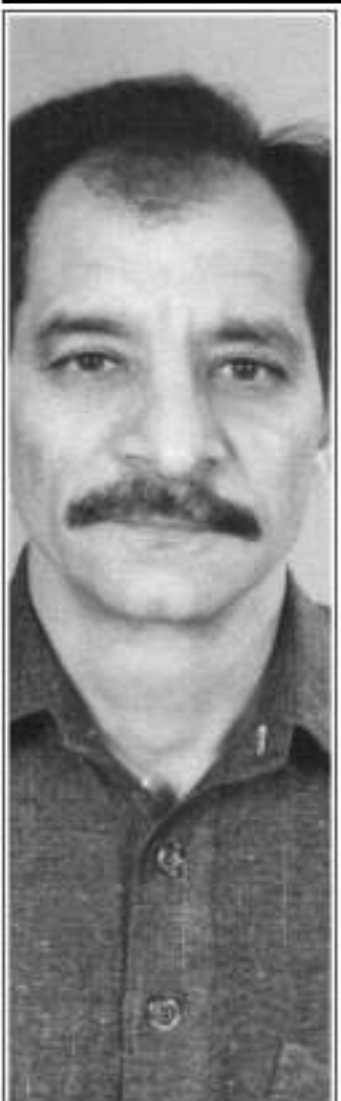

طاہر ناصر علی

دل فسردہ بہ چشمِ تر آئے
ایسا لگتا تھا کر رہے ہیں وداع
یاد کرتے ہوئے اُسے آخر
جسکو دیکھا وجود میں اپنے
شیشۂ اعتبار کیا ٹُوٹا
جب سے آئیں نئی نئی چیزیں
آسماں اشکبار ہوتا ہے
ہو گئے دُور ایک لمحے میں
زندگی میں جنھیں بُھلا نہ سکے
زخمِ دل دیکھ کر ہوا محسوس
یہ تسلسل ہے زندگانی کا
تیری محفل میں دوسروں کی طرح
بول اُٹھے لوگ دیکھ کر مجھ کو
ملنا چاہے گا ہر کوئی آ کر

ہم نے عالم کو بہت بور کیا

بات ہی ایسی تھی ہم دونوں میں
بات سے جس کو بڑھایا نہیں جا سکتا تھا
صبح کے سات بجے سے چل کر
رات کے گیارہ بجے تک پہنچے
اور پھر نیند میں بھی چل سو چل، چل سو چل
سرتاپا دھکم پیل
عالمین اپنی بنت کی باری ہم سے
لیتے رہے باری باری
ڈور کے لچھے چڑھائے ہوئے بالشتوں پر
تار کے گولے گھماتے ہوئے
انگشتوں کے دس نمبروں پر
کاتا سوت کی صورت، سیرت
اَنت سے پھسلی ہوئی پوروں پر
کچھ دباؤ بھی تو بے اَنت کا تھا
رنگ کچے تھے، رگ وپے میں گھلے
گھلتے رہے
دھاگا بندوں میں جو ہم دو تھے، کھلے
کھلتے رہے
ڈوریا، ڈوریا، تھم...... خا کیا، خا کیا، رُک!
جانے دونوں میں سے آواز پڑی تھی کس کو
ہم نے یہ صوتی تکمیل آڑے نہیں آنے دی
زندگی دونوں سِروں پر کھڑے ہو کر دیکھی
رخ کیا قبلہ گہِ شرق کو بھی، جلوہ گہِ غرب کو بھی
جال ہی جال بس اوڑھائے اِن آبادیوں کو
اور سرکتے گئے ہم، رکھتے گئے پاؤں پہ پاؤں
اِک چھناکے کا ہوا تجربہ لہروں لہروں
لہریا، بندہ بشر...... کون مگر، کون بشر!
بندہ بشر، بندہ بشر، بندہ بشر
گلیوں گلیوں کا یہ گنجان تموّج برتا
گھر کو پلٹے
کھاٹ کو کھونٹی سے کھول کے چھت پر بچھا
نیند کی باری تھی، نیند آنے لگی!

شاہین عباس

نظم

[اویس الحسن کے لیے]

جن کا سُخن میں اعلیٰ و ارفع مقام ہے
صوفی مزاج ہیں وہ اویس اُن کا نام ہے

دل کو سنبھالتے ہیں بڑی مشکلات سے
دانش ٹپک رہی ہے ہر اِک اُن کی بات سے

پانی سے دل میں آگ لگاتے ہیں برملا
کتنا عجب ہے عشقِ اویسیؓ کا سلسلہ

راہِ سلوک پر بھی چلے جا رہے ہیں وہ
بندوں کے ساتھ رب سے ملے جا رہے ہیں وہ

جیون کو اپنے کر کے تصوّف میں وہ بسر
خوش حال ہیں وہ لوگوں میں خوشیوں کو بانٹ کر

اُن کا ہے ربط عشقِ حقیقی سے دوستو
تم بھی خدا سے ایسا مقدر ہی مانگ لو

شاعر بھی ہیں وہ خوب تو اچھے ادیب ہیں
خوش بخت ہیں ندیم بہت خوش نصیب ہیں

ریاض ندیم نیازی

غزہ کا بچہ

نیلم احمد بشیر

ماں مجھے بہت بھوک لگتی ہے

تم تو اب رہی نہیں جو مجھے روٹی کھلائے

ماں مجھے وہ کہانیاں یاد آتی ہیں جو

تم مجھے سناتی تھیں

وہی کہ اللہ میاں، بھوکوں کے لیے،

آسمان سے روٹی نیچے اتارتا ہے

ماں میں جب، اونچے آسماں کی طرف دیکھتا ہوں نا

تو ایک بھوکا بم، ایک میزائل، نیچے کی طرف

دوڑا چلا آتا ہے

اور مجھے ہی کھا جاتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کب یہ دیوارِ بے رُخی نہ رہے
کیا خبر کب وہ اجنبی نہ رہے

نثری نظم

اداس دن ہیں اداس راتیں
فضا میں نجانے کیسا سکوت ہے
اداسیاں ٹھہر گئی ہیں
سوچ پر قدغن لگی ہے
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے
بیاں کروں تو زباں کٹے گی
خاموشیوں کی چیخیں کون سنے گا
سنا ہے
امیر شہر نے حکم نامہ جاری کیا ہے
کہ سب کی سماعتوں میں پگھلا ہوا سیسہ
انڈیل دیا جائے
شہر میں رقصِ وحشت جاری ہے
گونگے سناٹے بولتے ہیں
زمیں کی گود بانجھ ہو چکی ہے
انصاف نے پھندا لے کر خودکشی کر لی ہے
شائد اب کبھی سورج نہ نکلے
قاضیٔ وقت نے تاریکیوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے
جب سے اجالا بکھیرنے والے ہاتھ
قلم ہوئے ہیں کوئی روشنی کی تمنا نہیں کرتا
زمیں زادے روشنی کو ترستے ہیں
آنکھیں اندھیروں میں دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں
مصلحتوں نے
سوچ کے پر کاٹ کر
اڑان چھین لی ہے
اب میری فکر فقط میری شخصی آزادی
تک محدود ہے
میرے آدرش نے اونچی پرواز بھرنا چھوڑ دیا ہے
شہر میں گھروں کی جگہ قبروں نے لے لی ہے
زنجیرِ عدل برسوں سے خاموش ہے
فکر صدیوں کی غلام
خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی
نابینا آنکھوں کے اکثر خواب
بینا ہوتے ہیں

نائیلہ راٹھور

فلسطین جل رہا ہے

ہم اکیلے ہیں ساری دُنیا میں
بھیجتا کوئی بھی نہیں امداد
قدر کیا ہے ہماری دُنیا میں
کسی نے بھی رکھا نہیں ہے یاد

ہے جو دُشمن ہمارا اسرائیل
مُلک جتنے بھی ہیں یہاں مُسلم
اِس کو امریکہ دے رہا ہے ڈھیل
میں تو کہتا ہوں ہیں سبھی ظالم

یہ جو بچوں پہ بم برستے ہیں
سب کے سب ہیں غلامِ امریکہ
پانی کی بوند کو ترستے ہیں
بد سے بدتر ہے نامِ امریکہ

کر دیئے ہیں ہمارے گھر برباد
کون ہم کو بچانے آئے گا
اب بھلا ہم کہاں کریں فریاد
کب یہ وحشت کا دور جائے گا

بچے معصوم ہو گئے ہیں شہید
کیا ہمارے لیے خوشی کی نوید

عورتوں کو نہیں ہے بخشا گیا
اِس قدر کاری اُن پہ وار کیا

ملبے کا ڈھیر بن گئے ہیں مکان
اب ہیں آباد صرف قبرستان

شیر خواروں کو موت دے دی ہے
بربریت کی انتہا کی ہے

علی حسین عابدی

بے کار زندگی کا ترجمہ

کچھ بھی ہو
زندگی سے تیز بھاگنے کی خواہش
فضول
بے کار اور لاحاصل ہے
کچھ بھی ہو
خود اذیتی کا مرہم
کوئی اور
سوائے میرے
کہیں بھی نہیں
کچھ بھی ہو
دُنیا
فریب کا جال
مطلب کے سمندر میں
روز پھینکتی ہے
نئی مچھلی کی تلاش کا عمل
ہمہ وقت جاری ہے
کچھ بھی ہو
من کے پُر اسرار جنگل میں
بھوک
تضاد کے بھنور سے نکلتی ہے
ہر محبت کا ایک اپنا عکس
نقش ہے
ہر خواب کی تعبیر کے مختلف ذائقے ہیں
کچھ بھی ہو
ہمارے زخموں کی جڑوں سے
ماضی کی جنم کنڈلی کا سُراغ ملتا ہے
جنم در جنم کا فلسفہ
زمین کی مٹی سے روز نکلتا ہے
کچھ بھی ہو
زندگی
نئے معانی کی تلاش
مفاہیم کا انبار لیے
مجھ پہ حملہ آور ہوتی ہے
اور میں
خواب سرائے کی نمو پزیری سے
ہر مرتبہ نیا نکلتا ہوں

امجد بابر

ثلاثی معریٰ (نظمیں)

نہ دل تیرا یہاں "والعصر" لگتا
کبھی رونق جہاں کی یہ نہ بھاتی
سمجھ میں گر "تکاثر" تیرے آتی

.....

مرنے والے پہ کیا گزرتی ہے
ہم یہ عاصم سمجھ نہ پاتے ہیں
ہم تو دفنا کے لوٹ آتے ہیں

.....

آیا غم گیں نظر جو کوئی بھی
ہم نے سینے لگا لیا اس کو
جینے کا حوصلہ دیا اس کو

.....

اِس قدر اہتمام مت کرنا
مجھ کو خانہ بدوش یہ ٹولے
درس دیتے ہیں بے ثباتی کا

.....

زخمیوں کو کہاں بچانے کو
گاڑی کے گرتے ہی بخاری سب
لوگ بھاگے کماد کھانے کو

.....

جا تجھے بد دعا نہیں دیتا
سربراہی نصیب ہو تجھ کو
بگڑے تگڑے کسی ادارے کی

عاصم بخاری

یاد کی راہیں

کبھی جو ملے وہ اجنبی
یاد کی گزری راہوں پہ
کہ وقت کی دھول سے اَٹے ہوئے
اس کے بے ترتیب بالوں کو
سوچنا ماہ و سالوں کو
کہ یہاں کے سال موسموں پہ
ابھی نگاہیں ٹھہری ہیں
بے کسی کی دروزتیں
احساس کی کومل جنبشیں

لمحہ بھر کو بھی ٹکرائیں آ کر
درد بھری آنکھوں سے
تو اس
بے موسمی برسات کو
کوئی روک نہ پائے گا
اک لمحہ مختصر میں
کوئی جان سے جائے گا

☆☆☆☆☆

فصیحہ آصف خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زخم لگا تھا مگر لہو نہ بہا تھا
بحرِ خموشی تھا میں، وہ سنگِ صدا تھا

دور صحرا میں [نثری نظم]

دور صحرا میں
کسی مغنی کی صدا پہ
ریت کے ذروں کی مانند
ایک سرخ ہالہ محوِ رقص ہے
چاند کی شفاف چاندنی میں
اس کے
آبلے موتی کی طرح چمک رہے ہیں
یا واقعی یہ موتی ہیں
جنہیں کوئی ڈھونڈ لایا ہے
قلزمِ دشت کی گہرائی سے
تم کیا جانو!
کیا ہوتی ہے گہرائی
اپنے وجود کو فنا کے لبادے
میں چھپا کر
نظر آتی ہے گہرائی
وحشتِ دل کو تسکین دیتی
اور ازلی عطش کو سیراب کرتی
گہرائی
یہ عطا ہو
تو وجود
ایک سرخ ہالے کی مانند
عالمِ بے خودی میں
صحرا میں رقص کرتا نظر آتا ہے
تم اس تک پہنچ نہیں سکتے
یہ نہ تو سراب ہے
نہ ہی وہم
یہ تو حقیقت کا اشارہ ہے
جسے تم صرف
محسوس کر سکتے ہو
لیکن ٹھہرو!
پہلے فنا کے لبادے میں
خود کو ڈھانپ لو
فنا کے لبادے میں
خود کو ڈھانپ لو!

صبا نیاز صدیقی

ڈاکٹر نثار ترابی کے لیے

"Sir"

Nisar Turabi, a soul not of this earth,

A rare being, a gem, in a world of mirth.

Blessed students, under your guiding light,

Fortunate friends, basking in your friendship bright.

No dirt resides within your noble heart,

A boundless embrace, a work of art.

Poet of greatness, wisdom's reservoir,

An advisor sincere, a guiding star.

Qualities myriad, too vast to proclaim,

In this short verse, I merely skim the frame.

May you, like a star, forever shine,

A radiant presence, truly divine.

فاطمہ عثمان

The Riddle of Sphinx

کیا معمہ ہے یہ زندگی بھی!

جسے آدمی

لاکھوں صدیاں

کئی صد زمانے

گزر جانے کے بعد بھی حل نہیں کر سکا

اس معمے کے حل کے لئے

ڈیلفی کی پہاڑی سے آئے

کسی شاہزادے،

کسی ایڈیپس کی ضرورت نہیں

اس معمے کا حل اور کوئی نہیں

بلکہ خود آدمی ہے۔۔

مگر آدمی

آج ہے

آدمی کل نہیں

آدمی خود معمہ ہے جس کا کوئی حل نہیں۔۔!

مہر علی

خط

حامد یزدانی

السلام علیکم عمران بھائی!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

پاکستان کی انتخابی سراسیمگی اور سیاسی ماحول کے حوالہ سے خبریں ملتی رہتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں لگتا کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے سیاست کے سٹیج پر ایک کھیل دکھایا جا رہا ہے اور بار بار دکھایا جا رہا ہے۔ منظر تو منظر مجھے تو مکالمے بھی وہی لگتے ہیں۔ معاشی میدان میں بپا ''بے ترتیبی'' بھی اجتماعی سماجی بے سمتی کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ حال آں کہ، سنتے یہی آئے ہیں، کہ عمر کے ساتھ ساتھ شعور بھی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور معاملہ فہمی اور سمجھ بوجھ بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

میرے خیال میں اس سوچ کا اطلاق فرد ہی نہیں معاشرہ کی زندگی پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یوں سوچتا ہوں تو ایک سوال سر اٹھائے سامنے کھڑا پاتا ہوں:

کیا ہم بحیثیت قوم سمجھ دار اور بالغ ہو چکے ہیں؟

اللہ کرے جلد کسی مختلف اور مثبت تبدیلی کی خبر ملے۔

یہ تو بس دل کی بھڑاس تھی جو آپ کے سامنے نکال لی۔ مجھے، دراصل، اعتراف تو اس حقیقت کا کرنا ہے کہ ان تمام تر اجتماعی بے قاعدگیوں کے کنارے کنارے چلتے ہوئے آپ محترم خالد احمد صاحب کے خواب اور ہم سب کے چہیتے ''بیاض'' کی اشاعت کو مسلسل باقاعدگی کی ڈگر پر رکھے ہوئے ہیں۔ ہر شمارہ فی الواقع جدید تر اردو ادب کا اشاریہ ہوتا ہے جیسا کہ جریدہ کی پیشانی پر رقم ہے۔

نظم و نثر کے دونوں حصے لائقِ مطالعہ تخلیقات سے آراستہ ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے مجھ سا دُور افتادہ بھی اردو ادب کی رفتار سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں آپ مجھے بھی شرکت کا موقع دیتے ہیں۔ یہ میرا اعزاز اور خوش بختی ہے۔

اِس بار جرمن زبان کے رجحان ساز شاعر ایرش فریڈ کی زندگی و نظریات اور ان کی چند منتخب نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل تحریر آپ کے توسط سے اہلِ بیاض کی نذر ہے۔ امید ہے پسند کی جائے گی۔

مضمون کے ساتھ ایرش فریڈ کی ایک پرانی اور اپنی نسبتاً تازہ تصویر بھی بھیج رہا ہوں۔ شامل کر لیجیے گا۔ شکریہ

عمران بھائی، دنیا کے اِس ''قدرے'' سرد تر کونے یعنی کینیڈا کا چکر اب کب لگائیں گے؟ بتائیے گا۔ اِس بار گذشتہ ملاقاتوں میں رہ جانے والی تشنگی مٹانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ ان شاءاللہ

''بیاض'' میں آپ کے تمام ساتھیوں اور دوستوں کی خدمت میں سلام، دعا اور آداب

مخلص

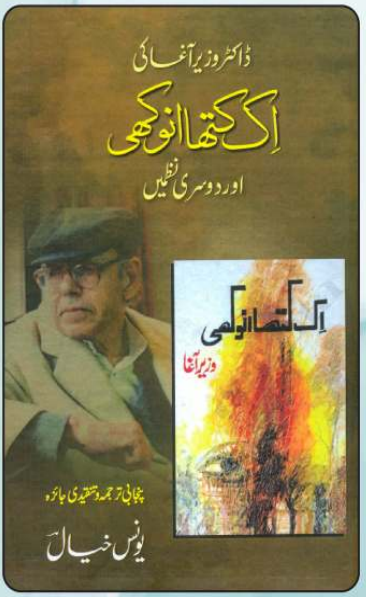

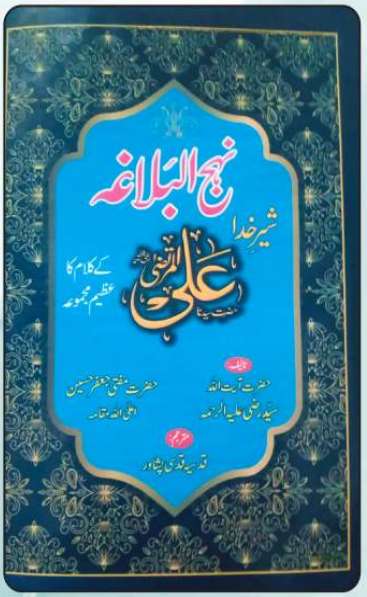

نہج البلاغہ
شیرِ خدا
علی المرتضیٰ
کے کلام کا
عظیم مجموعہ
تالیف
حضرت آیت اللہ
سید رضی علیہ الرحمہ
حضرت مفتی جعفر حسین
اعلی اللہ مقامہ
مترجم
قدسیہ قدسی پشاور

ڈاکٹر وزیر آغا کی
اِک کتھا انوکھی
اور دوسری نظمیں
اِک کتھا انوکھی
وزیر آغا
پنجابی ترجمہ و تنقیدی جائزہ
یونس خیال

کٹے کس طرح زندگی کا سفر
محمد آفتاب تابش

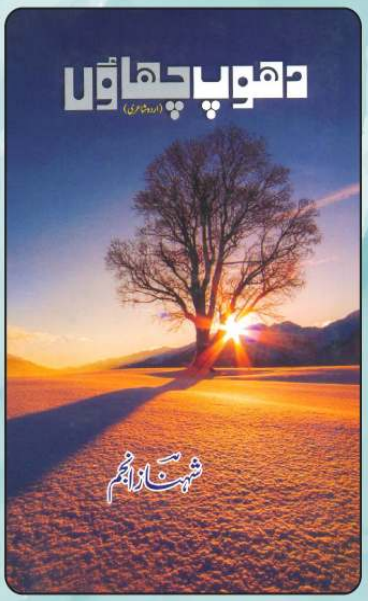

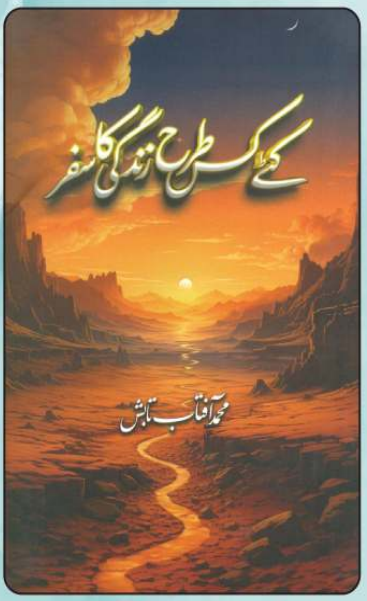

دھوپ چھاؤں
(اردو شاعری)
شہناز انجم

جناب نجیب احمد، جناب خالد علیم

جناب خالد علیم، جناب عامر شفیع، جناب سعد اللہ شاہ، جناب آصف شفیع، جناب زاہد محمود شمس

جناب خالد علیم اپنے والد جناب علیم ناصری اور جناب حامد یزدانی کے ساتھ